

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_222217**

UNIVERSAL  
LIBRARY



OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 891.4334 . 15260 .  
Accession No. ۸۹۱۵۲۳۳۲ ۱۵۲۱۰

Author جی آر کونین 15260 .

Title آوازِ بیدار

This book should be returned on or before the date last marked below.

---



# آنسو اور پینہ۔

دین بٹھا  
ڈاکٹر آر پی بہادر  
ایم۔ اے، ڈی۔ فل۔ خا  
الہ آباد یونیورسٹی

الہ آباد

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

ملنے کا پتہ:- ہرش چندر-۳۳ پکھری روڈ- الہ آباد

باہتمام- حکیم رمضان علی- اسرار کرمی پریس

جالسین گنج- الہ آباد-

اس کتاب کو معنون کرتا ہوں اپنے دوست  
ڈاکٹر شبیبہ احمد کے نام

جو کسی وقت میرے دوست اور ناشر دونوں  
تھے لیکن چونکہ آنکھوں نے آج ناشر نہ ہوتے  
ہوئے بھی مجھے بطور ایک دوست کے نہیں  
چھوڑا اس لئے یہ ضروری ہو گیا کہ آنسو اور  
پسینہ، انھیں کے حُسنِ ذوق اور مذاق کو  
بھینٹ چڑھاؤں!

# فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۷	سیلاب	۱
۳۶	زندگی	۲
۵۲	تلاش بہت بڑا دور گزیرا گیا ہے	۳
۹۰	میرا پہلا براڈ کاسٹ	۴
۱۰۴	سوچ	۵
۱۲۷	میں کیسے لکھتا ہوں۔ کہانی	۶
۱۴۰	دعوت نظر	۷
۱۷۲	اردو ناول اور افسانے	۸
۱۹۰	بیمار	۹
۲۲۲	آنسو اور پسینہ	۱۰

# کتاب کے بارے میں

آنسو اور پسینہ، پہلے کمائیوں کے مجموعہ کی شکل میں چھاپنے کا ارادہ تھا۔ لیکن پیر کے نیچے سے اگر زمین ہی کھسک جائے تو کوئی کیا کرے۔ یعنی پہلے یہ خیال تھا کہ بقیہ زندگی افسانے ہی لکھتا رہوں گا۔ لیکن اس درمیان میں قسمت نے وہ وہ پلٹے کھائے اور کاروان زندگی نے وہ وہ منزل لیں طے کیے کہ افسانے کہاں سے لکھتا خود میں افسانہ کا مضمون ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اب افسانے لکھنے سے جیسے ایک قسم کی چڑھ پیدا ہو چلی ہے۔ دماغ کی وہ کیفیت ہو گئی ہے کہ وہ اب دنیا اور زندگی کو محض آباؤ اجداد ہی سمجھنے کا عادی ہو گیا ہے۔ دل کسی صورت سے بات بنا کر کہتے کو راضی نہیں ہوتا۔ اس لئے ٹرٹ، اور اس کے پہلوؤں پر آنکھ اٹھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اندر سے بار بار کوئی ہی کہتا ہے کہ جو کچھ کہتا ہے اور اگر کہنا ضروری سمجھتے ہو تو صاف صاف کہو۔ ہیسرو، اور ہیسروئن، بنا کر جو انھیں مصیبتوں میں ڈالتے ہو اور اس طرح کہانی کا پلاٹ، تیار کرتے ہو اور پھر زندگی، زمانہ اور آدمی کے بارے میں نہایت ہی رفیق، اور کبھی کبھی اچھے ہونے نیتوں پر پہنچتے ہو یہ بناوٹی طریقہ کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ اس طرح خود کو دھوکا دیتے ہو اور دوسروں کو بھی چنانچہ

افسانے لکھنا چھوڑ کر، یعنی گڈے گڑیا کی شادی کرانا اور اُن کے بچوں کو کفن پہنانا چھوڑ کر، سیدھی سیدھی بات جو کہنا ہے کہو۔ جس کو سننا ہوگا سننے گا یا اپنا راستہ لے گا۔ تم خواہ مخواہ کرطوی دو اور بیٹھی چاشنی کیوں دیتے ہو۔ آخر ہزبات کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ اگر دس بیس ہزار سال تک زندگی اور دنیا سے تجربے کر کے بھی آدمی نے اپنا بچپنا نہ چھوڑا تو تمہیں کیا پڑی ہے جو تم آج بھی اُسے بچہ سمجھ کر کرطوی دو اور بیٹھی بنا کر اُس کے گلے کے تیچے اتارنا چاہتے ہو۔

کہانیاں نہ لکھنے کی اپنی مجبوری اور دقت کو جس طرح میں نے یہاں پیش کیا ہے اُس کا پڑھنے والوں پر ایسا اثر پڑ سکتا ہے کہ گو یا قصداً سوچ سمجھ کر اس ذہنی یا عقلی نتیجے پر میں پہنچا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ صورت اصلیت سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ افسانے لکھنے کے خلاف اس قسم کی کوئی رائے قائم کر کے میں نے کہانیاں لکھنا نہیں چھوڑا۔ بلکہ مستقل ۶ سال تک کوشش کر کے بھی جب کہانیاں نہ لکھ سکا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید کہانیاں لکھنے کے لئے میرے اندر پہلی ہی ذہنی اور نفسی کیفیت ہی اب نہ رہی۔

اس کے برخلاف، آل انڈیا ریڈیو کی بدولت مذاجمہ یا سنجیدہ مضامین لکھنے کے لئے جب بھی قلم اٹھایا تو اس نئے کام میں خاص طور سے جی لگا۔ میں خود نہیں بتا سکتا کہ مجھے زیادہ کامیابی کہانی یا مضمون لکھنے میں نصیب ہوئی ہے۔ میں تو صرف یہی جانتا ہوں کہ

جہاں مضمون لکھنے کو جی چاہتا ہے وہاں کہانی لکھنے سے جیسے جی  
گھبراتا ہے۔ یہ تو دوسرے ہی بتائیں گے (اگر ان کو اس کی فرصت  
ہے) کہ آئندہ مجھے مضامین یا کہانیاں لکھنا چاہئے یا اب دونوں کی  
جان چھوڑنا یا دونوں سے اپنی جان چھوڑنا چاہئے۔

لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی کتاب لکھنا تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے  
کہ اگر اور طریقوں سے کھانے بھر کر کما لیتا تو کم سے کم میں تو اپنے کو  
اس مصیبت میں نہ ڈالتا کہ اینٹپٹی چوٹی کا پسینہ ایک کرسٹے فلم بڑی  
رگڑوں اور پھر اپنی تقدیر سال دو سال کے لئے کسی کاروباری  
ناشر کو سونپ کر بیس روپہ دس آنہ مہینہ راکٹھی، کماؤں۔ ادب  
برائے ادب، اور ادب برائے زندگی، پر اب تک بہت بحث ہو چکی  
ہے۔ لیکن جب اس قسم کی بحثیں ہوتی دیکھتا ہوں تو مجھے اس بات  
سے کڑھن ہوتی ہے کہ میری طرف جیسے کوئی توجہ ہی نہیں دے رہا  
ہے، کیونکہ دراصل میری جگہ تو ادب برائے پیسہ، والوں کی فہرت  
میں آتی ہے۔

یہ محض مذاق نہیں ہے بلکہ میں اس وقت اپنی سمجھ میں ایک  
نہایت ہی سنجیدہ بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ اور دل کے بارے  
میں نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ یہ بات بد تمیزی میں شامل ہوگی۔  
لیکن اپنے بارے میں کہنے کا اختیار ضرور رکھتا ہوں کہ میں خود  
اس وجہ سے نہیں لکھتا کہ مجھے کچھ ایسا احساس ہے کہ میں کوئی بڑی

بات کہہ رہا ہوں یا انسانیت کو نیا پیغام دے رہا ہوں۔ جہاں تک  
 انسانیت کو پیغام دینے کا سوال ہے وہ ایک زمانہ ہو اگرشن بھگوان  
 گوتم بدھ، مہاتما عیسیٰ، محمد صاحب اور دوسرے ہم کو دے گئے۔  
 لیکن غضب یہ ہے کہ اُس پیغام کو انسانوں نے آج بھی اپنا یا نہیں۔  
 بیچ بولنا، ایماندارى برتنا، دوسروں کو نقصان نہ پہنچانا، مجھوروں  
 کی مدد کرنا اب تک آدمی نے نہیں سیکھا۔ اس لئے بجائے کسی نئے  
 پیغام دینے کے ابھی ہمیں، بغیر ہمت ہارے، ہزار دہ ہزار سال تک  
 اسی پیغام کو آدمی کے کانوں کو سناتے رہتا ہے۔ اس کے علاوہ  
 اگر دنیا اور اُس کی تاریخ کے بارے میں جانتا ہے تو وہ ساری  
 باتیں بھی مذہبی کتابوں، ان سائیکلو پیڈیا ( Encyclopaedia )  
 اور دوسری تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ جہاں تک اونچے پایہ کے  
 ادب کا سوال ہے اُس کی مثال جو کالیداس اور شکسپیر سے لے کر  
 فرانسسیسی، جرمین اور روسی ادب اور برنڈتساکى کتابوں میں  
 موجود ہے اُس کو ہم آج بھی چھو نہیں سکتے۔ اس لئے اگر یہی چیزیں  
 ترجمہ کر کے لوگوں کو پھر سے پڑھانی جائیں تو پڑھنے والوں کو میرتی  
 اور میرے جیسے دوسرے لکھنے والوں کی کتابیں پڑھنے سے زیادہ  
 فائدہ پہنچے گا۔ اور اگر اس کے علاوہ بھی پڑھنے کی چیزوں کی ضرورت  
 ہے تو اُس کے لکھنے والے بھی تقریباً ہر ملک کے اپنی چوٹی پر  
 موجود ہیں۔ اس لئے ہماری ضرورت تو کسی طرف سے پیدا نہیں

ہوتی۔ پھر بھی ہم لکھتے ہیں۔

چنانچہ سوال تو دراصل یہ ہے کہ آخر ہم چھوٹ بھئیے لکھتے کیوں ہیں۔ اس کا جواب میری سمجھ میں یہ ہے کہ ہم پیسہ کے واسطے لکھتے ہیں۔ یعنی اس وجہ سے نہیں لکھتے کہ ہم کوئی فطین (genius) ہیں کیونکہ یہ معلوم ہے کہ ہم میں سے فطین بہت کم ہیں۔ ویسے تو فطینوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ وہ عام طور سے پیدا نہیں ہوتے۔ برنارڈشا کا بیان ہے کہ پیدائشی یا فطری قابلیت پانچ ہی فی صدی ہوتی ہے، پچانوے فی صدی قابلیت تو صرف قلم ہی رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پچانوے فی صدی قلم رگڑ کر بھی زندگی کے اخیر میں فطین (genius) ہونے کے حوصلے کو پورا نہیں کر سکتے۔

آپ کہیں گے کہ اگر سارے لکھنے والوں کا یہی نظریہ ہو جائے تب تو فطین پیدا ہی نہ ہو سکیں گے کیونکہ پھر ہر آدمی اپنے کو احمق سمجھ کر، سمیت ہار کر بیٹھ جانا چاہے گا۔ اس دلیل کی قیمت میں نائنے کو تیار ہوں۔ لیکن میرا اعتراض یہ ہے کہ اگر سب ہی لکھتے اور کتابیں چھاپنے لگیں، بالکل ویسے ہی جیسا اس وقت اس ملک میں ہو رہا ہے، تو فطینوں کا گلا تو زمانہ اس طرح بھی گھونٹ کر رکھ دے گا۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ جو بھی چار سطر لکھ سکتا ہے وہ

اَنَا نَا لِي كَحْكَ يَامَصْتَفِ بْنِ جَاتَا هَيْ - پھر وہ اخباروں اور  
 رسالوں کے پتے بھرنے لگتا ہے۔ اور جب کچھ پتے اس طرح  
 بھر لیتا ہے تو اس مواد کو کتاب کی شکل میں چھپا دیتا  
 ہے (جو میں کرتا ہوں)۔ پھر بازار میں کتابوں کی وہ بھر مار  
 ہوتی ہے کہ کتابوں اور ان کے لکھنے والے دونوں کو کوئی  
 کوڑی کے بھاؤ نہیں پوچھتا۔ کتاب لکھنے والوں کے ساتھ کتاب  
 چھاپنے والوں کی بھی گنتی بڑھتی جاتی ہے۔ ہر آدمی جو یہ جانتا  
 ہے کہ وہ چالاکی اور بھگی سے اس طرح جلد کچھ پیسے کمالے گا  
 وہ پبلشر بک سیلر بن جاتا ہے۔ پھر یہ لوگ کتاب لکھنے والوں  
 کے ساتھ وہ دھاندھلی اور زبردستی شروع کرتے ہیں کہ لکھنے  
 والا خون ہی تھوک کر مرتا ہے۔ اچھے بُرے لکھنے والوں میں کوڑی  
 فرق نہیں رہ جاتا۔ کتابوں کا بلنا پینچنے والے کی کوششوں پر  
 منحصر ہوتا ہے۔ پھر اچھے اچھے لکھنے والے آنے اور ٹکے مزدوری پر  
 پریس کے پروٹ، دیکھتے اور اس طرح اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش  
 کرتے ہیں۔ رسالوں میں اجرت پر کہانی لکھنے والے ساگ بھاجی  
 جیتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ رسالے والوں کو ان کے بجائے  
 کھاتے پیتے گھراؤں کے شوقین یا بدشوق لڑکوں لڑکیوں کے

سہ محض یہ مبالغہ نہیں ہے۔ ہمارے ایک چوٹی کے ادیب انہیں چیزوں

لکھے ہوئے افسانے چھپنے کے لئے مفت مل جاتے ہیں۔ اس طرح  
 فطینوں کی قوم ادب کے بازار سے بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور  
 بمبئی جا کر سینما کے لئے بھیرویں، لکھتی اور طرز گاتی ہے۔ یہ لکھتے  
 وقت مجھے اس کا احساس ہے کہ ولایت وغیرہ میں بھی اچھے پایہ  
 کے ادیب سینما کے لئے لکھتے ہیں۔ لیکن وہ لکھنے والے سینما کے  
 لئے ناول اور کہانیاں لکھتے ہیں، بھیرویں نہیں لکھتے۔ اور اگر  
 بھیرویں، لکھنا ہی ہے تو ہم سب بھیرویں، لکھنے کے لئے موجود  
 ہیں۔ لیکن اگر یہ ضروری ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی اور پُرت  
 سویترا ندن پننت ہی بھیرویں، لکھیں تو بہتر ہوگا اگر ڈوب  
 مرے یہ قوم۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر فطینوں کے ساتھ ہی  
 ہونا ہے تو بہتر ہو کہ اس قوم میں فطین نہ پیدا ہوں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ہم روک سکتے ہیں وقت  
 کے اس رُجحان اور طوفان کو؟ میرا جواب ہے، نہیں روک  
 سکتے! یعنی کیا ہم پھوٹ بیٹے لکھنا بند کر دیں گے محض اس  
 خیال اور احساس سے کہ اس طرح ہم اپنے قومی فطینوں کو

سے پریشان ہو کر ناول اور کہانی لکھنے کے بجائے ان دنوں ترکاری کاروبار  
 کر رہے ہیں۔ غریب ہو کر بھی آدمی غریب کہلانا نہیں چاہتا ورنہ میں ان کا نام  
 بیان لے سکتا تھا۔

مارے ڈال رہے ہیں؟ ہمارا جواب ہے، 'نہیں روکیں گے ہم اپنا لکھنا۔ اگر فطین مر جائیں گے تو ان کو مر جانے دیجئے اور ختم ہو جانے دیجئے' انھیں زمانہ کی بھینٹ چڑھ کر۔ لیکن آخر ہم اپنے بچوں کا گلا کیوں اور کیسے گھوٹیں؟ ہمارے سامنے بھی سوال روٹی کا ہی ہے۔ ہم بھی پیٹ بھر کھانے کو چاہتے ہیں۔ چاہے فطین یا چھوٹ بھئیے ہوں، سوال سب کے سامنے پیٹ بھر کھانے کا ہے۔ اور یہ بھوک سرمایہ داری کی دین ہے۔ سرمایہ داری کو کچھ ہم ہی تھوڑے لائے تھے۔ انسانیت ہی اسے لائی تھی، اس لئے پوری انسانیت اس کی قیمت ادا کرے۔ جس سماج کو اس کی تیز نہیں کہ کس کی کتابیں چھاپنی اور کس کی نہیں چھاپنی چاہئے، کون کتاب اچھی اور کون بُری ہے، اس سماج کو اسی آگ میں جلنا ہے جس میں وہ اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے جل رہا ہے۔ جہاں کتابیں نفع کے خیال سے چھاپی جاتی ہیں اور چھاپ کر صرف منافع ہی بڑھانے کے لئے پڑھے لکھے بزرگوں کو رشوت دے کر انھیں دکورس، میں کرایا جاتا ہے وہاں فطین نہیں پیپ سکتے۔ اس لئے اچھا ہی ہوگا اگر اس دیش میں فطین نہ پیدا ہوں۔ اصل میں آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں ڈارون کا Survival of the fittest

بھی باوجود اپنی ساری خرابیوں کے، کام نہیں کر رہا ہے۔ ہماری

زندگی جس کشمکش کی آج شکار ہو گئی ہے وہ صرف چھوٹ بھئیے پیدا کر رہی ہے۔ چھوٹ بھئیے کے بیٹے بھی چھوٹ بھئیے ہو رہے ہیں اور ان کے بیٹے بدترین چھوٹ بھئیے ہو رہے ہیں۔ یہ مشین کا دور ہے جب مشین کے پرزے بدل جاتے ہیں تو مشین بن کر تیار ہو جاتی ہے۔

خیر، یہ تو ایک بیچ کی بات پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے کتنا یہ تھا کہ اس مجموعہ میں پانچ افسانے اور پانچ مضامین شامل ہیں۔ صرف افسانے یہاں اس وجہ سے نہیں ہیں کہ دس افسانے میرے پاس تیار نہیں تھے۔ لیکن چونکہ کتاب کو چھپانا تھا اس لیے افسانے اور مضامین ایک جگہ اکٹھا کر کے ’آنسو اور پسینہ‘ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ افسانے پڑھنے کے بعد مضامین پڑھتے وقت، لذت بدلتے رہنے سے، کچھ پڑھتے والوں کو خاص مزہ آئے۔ اگر ایسا ہوا تو میری افسانہ نہ لکھنے کی مجبوری پھر کیا ہی گل کھلائے گی۔

مجموعہ کا نام ’آنسو اور پسینہ‘ اس وجہ سے ہے کہ اس میں ’آنسو‘ بھی ہیں اور ’پسینہ‘ بھی، میرے ہی نہیں بلکہ ان سب کے جو کسی نہ کسی شکل میں اس کتاب میں موجود ہیں۔

’سیلاب‘، میرا نیا افسانہ ہے جس کے لکھنے میں فن اشاریت سے کام لیا گیا ہے۔ اسیسویں اور بیسویں صدی کے درمیان انگریزی

پونجی اور مال ہندوستان میں اس کثرت سے آیا کہ اس نے ہماری اقتصاد  
زندگی کو جیسے سیلاب کا شکار بنا دیا۔ چنانچہ ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ یا تو  
ڈوب گیا یا بہ گیا۔ اس سیلاب سے جو بچے وہ بھوک، بخار، جاڑا،  
ہیضہ، پلنگ اور مقدمہ بازی سے تباہ ہوئے۔ غرض کہ سیلاب، صرف  
افسانہ نہیں ہے، بلکہ اس میں آپ کو ہندوستان کی انیسویں اور شروع  
بیسویں صدی کی معاشی تاریخ ملے گی۔ افسانہ کے اخیر میں انگریزی فن  
طب کوٹ تمبھض پہنے ہوئے دیا ہو، کی شکل میں جاگیر دار ہندوستان  
( Feudal India ) کی نبض دیکھ کر اس کی موت کا اعلان  
کرتا ہے۔

زندگی، ایک مذاجیہ مضمون ہے جسے میں نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ  
سے براڈ کاسٹ کیا تھا۔ تقریب کا سلسلہ تھا، ”بہت شور سنتے تھے۔“  
تلاش بھی نیا افسانہ ہے، جس میں طوائف کی دنیا کا دوسرا پہلو پیش کیا  
گیا ہے۔ زرینہ، کی عام مقبولیت دیکھ کر مجھے شہمہ ہوا کہ شاید میں نے اس  
افسانے میں طوائف کی زندگی کے ایک ہی پہلو پر روشنی ڈالی تھی۔  
اس لئے دوسرا پہلو بھی پیش کرنا ضروری ہو گیا۔ میرا پہلا براڈ کاسٹ،  
بھی ریڈیو کے لئے ایک مذاجیہ مضمون تھا جو براڈ کاسٹ نہ ہو سکا لکھنؤ  
ریڈیو والے مذاجیہ تقریروں کا ایک سلسلہ چلا رہے تھے جس کا نام تھا  
”زندگی کی سرخیاں“ لیکن میرے لکھنؤ نہ جانے کی وجہ سے یہ بان چیت  
براڈ کاسٹ نہ ہو سکی۔

’سوتج بھی نیا افسانہ ہے جس کے ہر کردار کو سوتج کا گھن لگ  
 یا ہے۔ ہیرو، اس کا ایک کرانت کاری (انقلابی) ہے، جس کی موت  
 سائیت ہی غیر انقلابی ڈھنگ سے ہوتی ہے۔ سوتج نے سروج  
 بابو کو مارا اور جو جی رہے ہیں انھیں بھی سوتج ہی مار رہا ہے۔  
 غرض کہ یہ افسانہ شروع سے آخر تک سوتج ہے۔

”میں کیسے لکھتا ہوں۔ کہانی“ لکھنؤ ریڈیو سے براڈکاسٹ

کی ہوئی ایک بات چیت ہے۔ ”میں کیسے لکھتا ہوں“ تقریروں کے  
 سلسلہ کا نام تھا اور مجھ سے کہانی لکھنے کے بارے میں بولنے کے  
 لئے کہا گیا تھا۔ ”اردو ناول اور افسانے“ بھی ایک ایسی ہی ریڈیو  
 کی بات چیت ہے، جسے میں نے ہندی کی دنیا کو خطاب کر کے  
 براڈکاسٹ کیا تھا۔ بات چیت کا سلسلہ تھا ”چراغ تلے اندھیرا“  
 جس میں اردو لکھنے والے ہندی کی دنیا کو اور ہندی لکھنے والے  
 اردو کی دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اردو اور  
 ہندی ادب میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔

’دعوتِ نظر‘ اور ’بیمار‘ ایک طرح سے میری پرانی  
 کہانیاں ہیں، جو ہندی رسالہ ’وچپار‘ میں کبھی کبھی تھیں لیکن یہاں  
 اس کتاب میں شامل کرتے وقت میں نے ان کو بالکل بدل ڈالا ہے،  
 تنہا ہی جتنا کسی پرانی چیز کو بدلایا ستوارا جاسکتا ہے۔ ’دعوتِ نظر‘  
 سے خاص دلچسپی نوجوانوں کو ہوگی اس لئے کہ یہ کہانی میری زندگی

کے ایسے ہی دور کی لکھی ہوئی ہے۔ امید ہے کہ اس کی وجہ سے اس مخصوص سن کے پڑھنے والے اس کتاب سے بالکل مایوس نہ ہونے پائیں گے! بہت سارے ایک سنجیدہ مزاج نوجوان کی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے، خاص طور سے جب وہ حسن اور عشق سے مایوس ہو کر فولاد، کاکر دار بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کبھی اُس کے لئے عورت بالکل سرکنڈے کی بنی ہوئی نہیں ثابت ہوتی، جیسا کہ وہ اپنے انقلابیت میں سوچے بیٹھا تھا۔

آنسو اور سپینہ، نیا مضمون ہے جس کو میں نے خاص طور سے اس کتاب کے لئے لکھا ہے۔ یہ مزاحیم یا سنجیدہ ہے، میں خود طے نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتا ہوں۔

رام پرتاپ بہادر

---

# سیلاب

وہ گاؤں دریا کے کنارے، دریا سے لگا ہوا، پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن اگر سوچے تو پہلے اور آج میں بہت فرق ہے۔ یعنی پہلے اُس گاؤں میں منگوسا ہوتے اور اب وہ نہیں رہے۔ منگوسا ہو آدمی تھے، گاؤں نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی اُس دریا کے کنارے، دریا سے لگے ہوئے گاؤں کو، جس کو آج بھی تھنٹھین کہتے ہیں، منگوسا ہو کر سوچے بغیر نہ پہلے کوئی سوچ سکتا تھا اور نہ اب سوچ سکتا ہے۔

جب منگوسا ہو زندہ تھے تب ایسا تھا اور آج جب وہ نہیں رہے تب بھی ایسا ہے۔ یعنی ایک زمانہ تھا جب ہم تھنٹھین کو منگوسا ہو کے دھن اور اُس پاس میں پھیلے ہوئے اُن کے اثر اور دبدبے کو سوچ کر سوچتے تھے اور آج اُن کے نہ ہونے پر ہم تھنٹھین کو منگوسا ہو کی یاد کو تازہ کر کے سوچتے ہیں۔

دیہاتی بول چال میں تھنٹھین کے مطلب ہوتے ہیں تھوٹھین، یعنی شیتیر، یعنی وہ لمبی، موٹی اور مضبوط لکڑی جس کو بنتے ہوئے

مکانوں کی دیواروں پر رکھ کر اُس کی مکر کے سہارے کھیر لی یا پھوس کی چھت بچھاتے ہیں۔ اُسی کو جب کنوئیں پر ڈال دیا جاتا ہے تو اُس کے سینے پر پیر رکھ کر دیہاتی عورتیں پانی بھرتی ہیں۔

کنے کا مطلب یہ کہ تھنٹھیں بیچ مچھو تھنٹھیں تھا، کیونکہ اُس پاس کی پچاسوں میل کی دنیا کے لئے تھنٹھیں حقیقت میں تھو تھنٹھیں کا کام کرتا تھا۔

تھنٹھیں راہتی ندی کے کنارے بسا ہوا ہے، اور راہتی سال کے کسی موسم میں سوکھتی نہیں، اس لئے کہ راہتی پہاڑوں سے نکلتی ہے اور سو دو سو میل زمین کی نیچائی اور چائی پر بہ کر سرجو سے مل جاتی ہے، اور پھر سرجو گنگا میں مل جاتی ہے۔ اور اگر راہتی سوکھ جاتی تو تھنٹھیں سوکھ جاتا کیونکہ راہتی تھنٹھیں کے لئے وہی تھی جو شہتیر مکانوں کی چھتوں کے لئے یا کنوئیں پر پانی بھرنے والی عورتوں کے لئے ہوتی ہے۔ جس طرح راہتی پر بہتی ہوئی تجارت تھنٹھیں کی جان تھی اسی طرح تھنٹھیں اور مہنگو ساہو کی دولت اور تجارت اُس پاس کے پچاسوں میل تک پھیلے ہوئے دیہات کے لئے شہتیر کی طرح سہارے کا کام کرتی تھیں۔

تھنٹھیں کے لئے مہنگو ساہو وہی تھے جو تھنٹھیں تھا مہنگو ساہو

کے لئے۔ بلکہ کچھ کا خیال تو یہ بھی تھا کہ منگوسا ہو ہی تھنیں تھے لیکن خود منگولوں نے ایسا کبھی بھول کے بھی نہ سوچا کیونکہ وہ اپنے کو تھنیں کی بددلت سمجھتے تھے۔ اُن کا ایسا خیال تھا جب اُن کے پاس دولت تھی، بیل اور بیل گاڑیاں بھتیں، گھوڑے اور سٹو تھے، اور جب اُن کے دھن کی شہرت نیپال کی ترائی میں سے ہو کر گزرنے والے سوداگر ہمالیہ پہاڑ کی وادیوں تک لے جاتے تھے اور اُن کے اُسی نام کو پوریوں میں بھر کر، راہتی سر جو میں لے جاتی تھی اور سر جو اُنھیں گنگا کے دور دراز کناروں پر اتارتی تھی۔

منگوسا جن تھے، سوداگر تھے، ساہو تھے، زمیندار تھے، پہلے آدمی تھے، کیا نہیں تھے۔ منگولوں کے وہاں لین دین ہوتی تھی، تجارت ہوتی تھی، ہلدی بکتی تھی، کھیتی ہوتی تھی، لوگوں کی بات اور عزت رہتی تھی۔ درجنوں اُن کے بڑے بڑے مکان تھے، سیکڑوں مویشی تھے، سواریاں تھیں، اور اُن کے وہاں انگنت بھیر، بکریاں کتے، طوطے، تیترا اور بٹیر پے تھے۔ غرض کہ اُن کے پاس سب کچھ تھا جو کسی بڑے آدمی کے پاس ہوتا ہے۔ اور اگر کچھ نہیں تھا تو وہ ہاتھی تھا، اور وہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ جس برادری کے منگوسا ہو تھے اُس برادری میں ہاتھی رکھنے کی جیسے خاندانی ممانعت ہی تھی۔

اس لئے منگو سا ہو جہاں سب کچھ رکھتے تھے وہاں صرف ہاتھی نہیں رکھتے تھے، ویسے ہاتھی کے خیال سے انھیں ایک طرح کا لگاؤ بھی تھا، جسے وہ کبھی بھلا نہیں سکتے تھے۔

بچے بھی ہاتھی کے تصور سے خوشی کے مارے پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن منگو کا ہاتھی سے جو ذہنی لگاؤ تھا وہ ان کا بچپنا نہیں تھا بلکہ وہ لگاؤ خاص طور سے اُس دن سے شروع ہوا جس دن انھوں نے دریائے کنارے سے مرچوں کی بوریاں خرید کر لوٹتے وقت ایک ننھے سے کھڑ ریح کو ہاتھی کے مستک کی اونچائی سے اڑتے دیکھا۔ لیکن اگر باوجود اُس شگون اور مرچوں کے بھاؤ بڑھ جانے کے منگو سا ہو راجہ نہیں ہوئے تو اُس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ اُن کے راجہ ہونے میں اُس کے بعد کچھ باقی رہ گیا تھا بلکہ منگو سا ہو جانی کی اُس صبح سے، جب انھوں نے کھڑ ریح کو ہاتھی

سے کھڑ ریح نام کی ایک چڑیا ہوتی ہے، جس کے بارے میں دیہاتوں میں کہیں کہیں ایسا یقین کیا جاتا ہے کہ اگر اُسے کوئی ہاتھی کے ماتھے کی اونچائی سے اڑتے دیکھ لے تو وہ راجہ ہو جاتا ہے۔

کے مستک اتنی اونچائی سے اڑتے دیکھا تھا، دن بدن اگر کچھ ہوتے تو صرف راجہ ہوئے۔ لیکن منگو نے راجہ ہو کر بھی اپنے کو راجہ کبھی نہ سمجھا۔ اس کے پیچھے صرف برادری کی بات نہیں تھی۔ بلکہ منگو راجہ ہونے سے بھی اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا وہ ہاتھی رکھنے سے ڈرتے تھے۔

لیکن ہاتھی کے نہ ہونے نے منگو سا ہو کو بے ہاتھی کے ہونے سے نہ روکا۔ بلکہ ہاتھی نہ رکھنے کے باوجود بھی جب سے بدلا تو جاں دوسرے ہاتھی رکھ کر ٹے وہاں منگو بنا ہاتھی رکھے مٹ گئے۔ جب وقت بدلتا ہے تو سب کے لئے بدلتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کسی کے لئے آج بدلتا ہے تو کسی کے لئے کل بدلتا ہے، کسی کے لئے کم بدلتا ہے اور کسی کے لئے زیادہ بدلتا ہے۔ جب منگو سا ہو کے لئے زمانہ بدلا تو وہ پورے شخصیت کے لئے بدلا، اور شخصیت کے ساتھ ساتھ ان ہزاروں لاکھوں کے لئے بدلا جو شخصیت کے آس پاس صرف شخصیت کی بدولت جیتے اور مرتے تھے۔ اصل میں وہ صرف زمانہ تھوڑے ہی بدلا تھا، بلکہ اس کے ساتھ دریا کا دھارا بھی بدلا تھا۔ اور جب دریا کا دھارا بدلتا ہے تو وہ یک ایک آنا فنا بدل جاتا ہے۔ چنانچہ وہی

راستی جو تھمتھیں کے کنارے کنارے چپ چاپ سال بہ سال بہا کرتی تھی اُس نے اپنا بہاؤ ایک برساتی رات میں یک بیک بدل دیا۔

اُس برساتی رات میں کیا کیا ہوا اور برساتی راستی نے تھمتھیں والوں کے ساتھ کیا کیا کیا آج تھمتھیں میں کم ہی لوگوں کو معلوم ہے۔ اول تو اُس رات سے بچنے والوں میں آج کم رہے، اور جو ہیں بھی اُن میں سے کوئی بہرا، گونگا یا اندھا ہو چکا ہے تو کوئی ایک زمانہ سے لقمہ کا مریض بنا چا رہا پائی پکڑے ہے۔ چنانچہ اگر آج ساٹھ اور نو اوہتر سال کی عمر میں کوئی ایسا بھی ہے جس کی زبان اب بھی چلتی ہے تو وہ ہیں منگوسا ہو۔ منگوسا ہو آج بھی دریا کے کنارے، دن ڈوب جانے کے بعد، ملاحوں کے ساتھ گانجے کی چلمنی کرتا ہے، یہ کہ جب سیلاب آیا تو گاؤں والے سو رہے تھے۔ دریا یوں تو صبح ہی سے بڑھ رہا تھا اور تیز بڑھ رہا تھا۔ لیکن دریا بہا برسات میں بڑھتا تھا اور بڑھ کر گاؤں کے شوالے کا چبوترہ چھو کر گھٹنے لگتا تھا۔ شوالے کے برگد کی لمبی جٹائیں جب برساتی پانی پی لیتی تھیں اور برگد کے نیچے بیٹھے ہوئے شیوجی کے چرن برساتی لہریں چھو لیتی تھیں تو پانی آپ سے آپ گھسکے لگتا تھا۔ چنانچہ جب سیلاب آیا تو گاؤں

الے سوئے ہوئے تھے۔ مہنگو ساہو بتاتے ہیں کہ رات میں ایک دم شور مچا۔ لوگ بے تحاشا مکانوں سے نکل کر بھاگنے لگے۔ لیکن باہر نکل کر گاؤں والوں نے دیکھا کہ گاؤں پانی سے لھر چکا تھا۔ پانی زور سے گاؤں میں گر رہا تھا۔ اُس کے شور سے کچھ اور سنانی نہ پڑتا تھا۔ صرف عورتوں، بچوں کا رونا چلانا اور دیواروں کا دھما دھم کرنا سنانی دیتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے جیسے وراگاؤں بہ چلا۔ مہنگو ساہو جھپٹ کر اندر گئے اور تیر کا بچرا باہر نکال لائے۔ پھر اپنی لڑکی اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر انھوں نے چاہا کہ سامنے کی لیک کو، جس پر پہلے بیل گاڑیاں ہلتی تھیں، پار کر کے دوسری طرف نکل جائیں۔ لیکن لیک میں چلی تھی اور پانی اُس میں زور مارتا ہوا بہ رہا تھا۔ بیوی کا ہاتھ ساہو کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دھاڑے لگے ساتھ بہتی نکل گئیں۔ مہنگو ساہو تیر کا بچرا چھوڑ کر تیرنے لگے۔ لڑکی نے مہنگو کی صدری پکڑ لی۔ جب مہنگو سامنے والے بیلے پر پہنچے تو لڑکی کی ساڑھی میں الجھا ہوا تیر کا بچرا ابھی کنارے لگا۔ رات کے اندھیرے میں مہنگو ساہو نے دیکھا تیری تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ گائے، بیل، بکریاں اور آدمی

بہتے چلے جا رہے تھے۔ منگو نے سامنے کے درخت پر لڑکی کو  
 بڑی سخت سے چڑھا دیا، اور خود بھی تیزتر کانچر طرے کر ایک  
 ڈال پر جا بیٹھا۔ صبح تک گاؤں کا تین چوتھائی حصہ دریا  
 کاٹ کر بہا لے گیا تھا۔ جو حصہ بچا تھا وہ ملاحوں اور چاروں  
 کی بستی تھی، جسکے صرف چھپر پانی کے اوپر دکھائی دیتے تھے۔  
 اس پاس کی دنیا پانی کی دنیا بن گئی تھی۔ کہیں کہیں درختوں  
 کی اوپر کی صرف شاخیں دکھائی پڑتی تھیں۔ منگو نے تیزتر کے  
 پنچرے کو ایک شاخ پر لٹکا دیا تھا، اور اس طرح وہ دورا تیں  
 اور ایک دن درخت پر بیٹھے رہے۔ لیکن لڑکی دوسری رات  
 کو اونگھ کر پانی میں گر پڑی۔ درخت کے نیچے پانی سوں سوں  
 کرتا ہوا بہ رہا تھا۔ لڑکی کے پانی میں گرنے سے جو دھماکا ہوا  
 اس سے منگو سا ہوا جو خود جھپکی لے رہے تھے، جاگ اٹھے۔  
 لیکن دھارے کی تیزی دیکھ کر بہت نیچے اترنے کی نہ ہوئی۔  
 لڑکی تیسرے دن ایک بہتے ہوئے کیلے کے تنے سے لپٹی ہوئی  
 کئی میل کی دوری پر زندہ پائی گئی۔

سیلاب جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے گھٹنے لگا۔

ڈیڑھ دن میں دریا اپنے پیٹ میں آگیا۔ گاؤں میں دس بیس

ادھیوں کو چھوڑ کر، جو درختوں پر لٹکے ہوئے تھے، کچھ نہ بچا تھا، سوال  
 کر کر دریا کے پیٹ میں چلا گیا تھا۔ ہمارا دیو جی بکھرے ہوئے اپنی جگہ  
 پر پڑے تھے۔ گاؤں کے بابو صاحب کا ہاتھی، جو شیوائے کے  
 پاس برگد تلے بندھتا تھا، برگد کے ساتھ زنجیر سے بندھا ہوا تیرہ  
 میل کی دوری پر مُردہ سر جو کے کنارے بتایا گیا۔

اتفاقاً سنا کر منگو سا ہونے صدی سے گھڑی نکالی اور اُسے  
 کندے کی آگ کے پاس لے جا کر دیکھا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ اس لئے  
 تیترا کا پنجر اُٹھا کر دریا کے کنارے سے چل دیئے۔

ٹھیک تو کوئی نہیں بتا سکتا، لیکن ایک زمانہ سے منگو سا ہوا  
 اسی طرح شام کے وقت دریا کے کنارے جاتے تھے، ایک ہاتھ  
 میں تیترا کا پنجر اور دوسرے ہاتھ میں سوٹا لے ہوئے۔ دریا کے  
 کنارے ضروریات سے فارغ ہوتے اور پھر ملاحوں کے ساتھ گاجا  
 پی کر سیلاب سے پہلے اور سیلاب کے بعد کی تفتیش کی کہانی  
 سناتے تھے۔ پوری کہانی ملاحوں کو کبھی معلوم نہ ہو سکی کیونکہ گھنٹہ  
 ڈیڑھ گھنٹہ اس طرح اپنی یا تفتیش کی داستان سنا کر منگو اپنی  
 آنکھوں کی گھٹی ہوئی روشنی سے، کندے کی آگ کے پاس اپنی  
 گھڑی لے جا کر، وقت دیکھتے اور گھڑی میں آٹھ بج دیکھ کر دریا

کے کنارے سے چل دیتے۔ پوری کمائی شاید کبھی ختم ہو بھی نہیں  
سکتی تھی کیونکہ مہنگو ساہو اور اُن کی ہر چیز دیا پر ناؤ چلانے والے  
لماحوں کے لئے نہ ختم ہونے والے داستان تھے۔

وہ اپنی گھڑی کے بارے میں بتاتے تھے جسے مع چین

کے صدری کے سامنے کی جیب میں ہمیشہ لئے رہتے تھے، کہ

اُسے اُنھوں نے ایک نیپالی سوداگر سے خریدی تھی۔ گھڑی کے

علاوہ اُن کے پاس ایک کبیل بھی تھا جس کے روٹس اُڑ گئے تھے،

لیکن انڈر کی اونی خول اب بھی باقی تھی، جس پر بال جھا کر وہ کبیل

بنا تھا۔ جہنگو ساہو بتاتے، گھڑی جرمنی میں اور کبیل ولایت میں

بنے تھے اور یہ دونوں چیزیں اُنھوں نے اُسی نیپالی سوداگر سے

خریدی تھیں جو، بقول مہنگو ساہو، ہر پانچ سال پر شخصیں سے

ہو کر بدیشی مال لئے گزرتا تھا۔ راستہ میں کبھی وہ سوداگر اپنا کوئی

مال بیچتا نہ تھا۔ ساری بدیشی چیزیں نیپال لے جا کر صرف مہاراجہ

اور بڑے اور چھوٹے سرکاروں کے ہاتھ بیچتا تھا۔ مہنگو ساہو کے

واسطے صرف اُس کا پریم تھا جو اُس نے ایک بار کبیل اور گھڑی

اُن سے ہاتھ بیچ دی تھی۔ گھڑی اور کبیل کی تعریفیں کرتے ہوئے مہنگو

کبیل کی عمر لگ بھگ ۴۸ سال بتاتے اور کہتے کہ وہ ولایتی کبیل اتنا

دم تھا کہ اُسے بدن پر ڈال کر اگر کوئی جاڑے کی رات میں باہر میدان  
 میں بھی پڑا رہ جائے تو سردی نہیں لگ سکتی تھی۔ اسی طرح گھڑی کی  
 بھی کمائی سُناتے، جس کو دیکھ کر مہنگو ٹھیک ٹھیک بتا سکتے تھے کہ  
 سورج ٹھیک وقت پر نکلا ہے یا نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تیس سال  
 سے گھڑی نہ کبھی بگڑی اور نہ کبھی مرمت کو گئی۔ باتوں میں وہ یہ بھی  
 لیتے کہ اگر گھڑی میں کبھی نہ دی جائے تب بھی وہ چلتی رہتی تھی۔  
 حالانکہ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی، اپنی یا گھڑی کی تعریف میں، کہہ دیتے  
 کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ وہ اپنی گھڑی میں کبھی دینا بھول گئے ہوں۔  
 وہ بتاتے تھے کہ سیلاب سے گھرے ہوئے جب وہ درخت پر بیٹھے  
 تھے تب بھی گھڑی میں کبھی لگانا نہیں بھولے۔ سیلاب آنے پر جب وہ  
 گھر سے نکل بھاگے تو گھڑی صدری میں تھی اس لئے وہ تینتر کی طرح  
 ان کے ساتھ چلی آئی۔ کبیل اُنھیں سیلاب کے بعد گری ہوئی دیوار  
 کے نیچے ملا۔ جہاں سیلاب میں اور ہماری چیزیں سڑ گئی یا بہ گئیں وہاں  
 کبیل کبیل تھا جو پانی میں بھیگ کر اپنا وزن لئے وہیں رہ گیا۔ مہنگو  
 سا ہو کی نظر میں اُس کبیل کی یہ بھی ایک بڑی خوبی تھی جو اُسے اتنا  
 بڑا سیلاب بھی نہ ہما سکا۔ اور جو اُس کے بال جھڑ گئے تھے اُس کے بار  
 میں اُن کا یہ خیال تھا کہ اگر وہ دیوار کے نیچے دب نہ جاتا تو اُس کے

بال ہرگز نہ گرتے کیونکہ جرمن گھڑی کی طرح ولایتی کمبل بھی امر تھا۔ نیپال کے سوداگر نے ایسا ہی بتایا بھی تھا۔ ملاحوں نے گھڑی تو دیکھی تھی لیکن کمبل انہوں نے کبھی نہ دیکھا۔ ہنگو ساہو جب یہ داستان سُناتے تو ہمیشہ کہتے "کمبل بھی کسی دن دکھاؤں گا" لیکن ملاحوں کے لئے وہ دن کبھی نہ آیا۔

اتنی داستان سُنا کر ہنگو نے نیپال کے سوداگر کی دی ہوئی گھڑی نکال کر دیکھی اور کہنے لگے۔ سیلاب بھی نیپال ہی سے آیا تھا۔ نیپال میں چاروں طرف پہاڑیوں سے گھرا ہوا ایک بہت بڑا نال تھا، جس میں برسات کا پانی اکٹھا ہوتا تھا۔ اُس سال نیپال میں اتنے زور کی بارش ہوئی کہ نال میں زیادہ پانی اکٹھا ہو جانے سے اُس پاس کی دھان کی کھیتی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ تالاب کا ایک باندھ کاٹ دیا گیا۔ راپتی یوں ہی بڑھی ہوئی تھی۔ باندھ کے ٹوٹنے سے پانی دزدنا ہوا آیا۔ تھنہیں کا تین چوتھائی دیکھتے دیکھتے راپتی کے پیٹ میں ہضم ہو گیا۔ سیکڑوں گاؤں اور ہزاروں آدمی راتوں رات بہہ گئے۔ جنہوں نے بھاگنے یا تیرنے کی کوشش کی وہ دو چار میل آگے جا کر ڈوبے۔ بچا کوئی نہیں۔ سولے اُن کے جو اُن درختوں یا مکانوں پر چڑھ گئے تھے جنہیں

سیلاب گرایا بانہ سکا۔ لیکن جو اس طرح بچ گئے انہوں نے  
 بچ کر بھی یہی محسوس کیا کہ جو نہیں رہے تھے وہی اچھے رہے، کیونکہ  
 جو رہ گئے تھے ان کے لئے زندگی خود ایک مستقل سیلاب بن گئی تھی جس میں  
 بچنے والے دن رات ڈوبتے اترتے رہے۔

انہیں بچنے والوں میں منگو بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی  
 اس مرنے کے ہاتھوں جی کر یہی محسوس کیا کہ اگر وہ بچے ہوتے تو  
 ترانہ ہوتا۔ لیکن ایسے جیسے کو بھی جینا ہی کہتے ہیں، کیونکہ اس طرح  
 بچنے والا بھی اپنی زندگی موت سے نہیں بدلتا۔ سیلاب کے بعد گاؤں  
 میں بخار کی بیماری چلی تھی۔ جو سیلاب سے بچے تھے وہ بخار سے فرس  
 اور بخار سے بچے وہ بھوک کے مارے گتوں، بلیوں کی موت مرے۔  
 اپنے گھر میں رہ گئے تھے، اپنی لڑکی کے علاوہ صرف منگو سا ہو لیکن  
 منگو نے چونکہ اس درمیان میں بیٹے کر لیا تھا کہ آخر میں کوئی کسی کا  
 ہیں ہوتا اور آدمی کو اپنی زندگی کا بوجھ آپ ہی ڈھونڈا پڑتا ہے، اس  
 لئے جب ہیضہ کی بیماری سے اکیلی لڑکی بھی چل بسی تو منگو زیادہ  
 مت نہیں ہارے۔ ہاں سر کے چند بال جو کالے رہ گئے تھے وہ بھی  
 سفید ہو گئے۔ چہرے پر جو جھڑیاں تھیں وہ مل کر لکیر بن گئیں۔  
 بچپے میں آدمی کارنگ یوں بھی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن منگو سا ہونے کے

بارے میں اب یہی آسانی سے نہیں بتایا جاسکتا تھا کہ وہ تم سے کس رنگ کے کپڑے لے پہلے بھی زیادہ نہیں پہنتے تھے اور اب ۶۹ سال کی عمر میں پہنتے بھی تو کیا پہنتے۔ ے دے کے، دھوتی کے علاوہ صدری رہ گئی تھی، جسے اب پہنتے کم کندھے پر ڈالے زیادہ رہتے تھے۔ باتیں ہاتھ میں وہ سوٹا رہتا جس پر جھک کر اب اُن کا بڑھا پا چلتا تھا۔ اور جب دریا کے کنارے صبح شام جاتے تو داہنے ہاتھ میں پنچر لکھی ہوتا، جس میں وہ تیزتر تھا، جسے منگوسا ہو اپنی جان کے ساتھ اُس سیلاب میں سے بچالائے تھے۔ پنچر اوہی رہا، لیکن تیزتر بدلتے رہے تیزتر اتنے دن جیتا بھی کیسے۔

منگوسا ہو کے پاس جب سب کچھ تھا تب بھی وہ صبح شام دریا کے کنارے جایا کرتے تھے اور جب اُن کے کچھ بھی نہ رہا اور اُن کا کوئی نہ رہا تب بھی اُن کے لئے وہی دریا کا کنارہ تھا۔ یعنی دریا کے کنارے جانا جیسے اُن کے جینے کا بیانا تھا۔ دریا میں نہاتے، سورج کی طرف منہ کر کے کھڑے کھڑے ایک لوٹا پانی گرا کر کچھ لنگٹانے پھر گاؤں کے دوسرے نہاتے آنے والوں سے باتیں کرتے۔ دریا کے اِس پار سے اُس پار اور اُس پار سے اِس پار اترنے والوں سے دس کال کا حال پوچھتے۔ تیزتر کو پانی پلا کر اُسے ریشیلی اودی زمین پر

دیکھ کھانے و چھوڑ دیتے۔ دُور دُور بازاروں میں بکنے جانے کی چیزیں جو کشتیوں سے اُترتی رہتیں اُن کا بھاؤ پوچھتے۔ اس طرح وہ روز صبح شام۔ ہاتھی سے لے کر میٹر تک، ہر چیز کے دام پوچھتے جو ادھر سے گذرتی۔ پھر واپس آکر گھر میں پڑ رہتے۔

دن رات کا بقیہ حصہ وہ کہاں اور کس طرح گزارتے یہ گاؤں والوں میں کم ہی کو یا شاید کسی کو بھی نہ معلوم تھا۔ منگو ساہو اب کیا کھاتے اور کیا کھاتے تھے یہ بھی کسی کو کیا معلوم ہوتا۔ اور اگر منگو کے اُس بھید سے کوئی واقف ہو سکتا تھا تو وہ اُن کا تیر تھا، جو گھر میں منگو کا اکیلا ساتھی تھا۔ جب دیوار کی نیو کھسک جاتی ہے تو کسی اور سہارے نہیں ٹکھرتی۔ اور جب کسی کا زمانہ بدلتا ہے تو عموماً اچھی طرح بدلتا ہے۔ چنانچہ سیلاب نے جہاں سارا دھن دولت لے لیا وہاں کس نے اپنے جان میں منگو کو جینے کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ تین گاؤں کی زمینداری دریائے کاٹ کر اُس پار کے زمینداروں کے حصوں میں ڈال دیا تھا۔ شیوال کے پیچھے منگو کا جو پکا مکان تھا وہ شیوال کے ساتھ راجپتی کے دھارے میں آگیا تھا۔ اور جب شیوال ہی گر گیا تو منگو کا مکان گرنا کیا بڑی بات تھی۔ یعنی جب بھگوان ہی پر آفت آئی تھی تو آدمی کا ردنا کیا رونا۔ جگ جگ سے تھنھیں دانے ماتے

آئے تھے کہ چاہے دنیا ڈوب جائے لیکن شیوالہ کو آہنج نہیں آسکتی تھی اس لئے آج جب شیوالہ نہیں رہا تو تھنھتیں کیسے رہتا۔

منگلو کے گھر میں جو دولت تھی اُس پر سے اب دریا بہ رہا تھا۔ کبیل کے علاوہ اگر کوئی اور چیز ملی تو وہ اُن کی ہی تھی، جس میں اُن کے لین دین کا حساب رہتا تھا۔ لیکن جو وہی مہینوں کچھڑ اور پانی کی ہو کر رہ چکی تھی اُس میں آدمی کا حساب بھی کیا ملتا۔ پیسہ مہنگو کا کس نے نہیں کھایا تھا۔ لیکن کس کے پاس کیا رہ گیا تھا جو مہنگو کسی سے پیسہ مانگتے۔ رگھوکل شکل نے اُنھیں اکثر یہ سمجھایا کہ قرض داروں کو نوٹس دے کر ثبوت کے لئے عدالت میں بھی جمع کر دو۔ لیکن پہلے عدالت میں جانا جو منگلو سا ہو اپنی عزت اور شان کے خلاف سمجھتے تھے اُنھوں نے اب دھن اور عزت نہ رہنے پر رگھوکل شکل کی بات پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ حقیقت میں وہ عدالت سے ڈرتے تھے۔ چنانچہ یہ سوچ کر کہ جو دعویٰ کئے بیٹھے تھے اُنھیں ہی کیا کچھ ملا جاتا تھا اُنھوں نے صبر کر لیا۔ رگھوکل کو اُنھوں نے یہ سمجھایا کہ عدالت کے سامنے ہی کی کچھڑیں سنی ہوئی ڈھیری کی کالکھ کی لکھائی ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

لیکن جہاں منگلو کی بھی دوسروں کے خلاف نہ چل سکی وہاں

دوسروں کی بیاں مہنگو کے خلاف خوب ہی چلیں اور ایسی چلیں کہ  
 ہا سہا زینداری کا حصہ اس طرح یک گیا۔ راپتی سے لے کر سر جو کے  
 کنارے تک جس جس کے روکڑ میں تین ہزار کی ہلدی، ساڑھے چار  
 ہزار کی مرنج، سات ہزار کا نمک اور نو سو ننانوے کا گڑ لکھا تھا وہ  
 سب سوڈر سوڈ جوڑ کر مہنگو نے سوت سوت بیچ کر ادا کرنا اپنا دھرم  
 سمجھا۔ چونکہ آدمی روزگاری تھے اس لئے سوچا زبان اور بات پر  
 اڑے رہو اسے بدلے گا تو یہی ایک کاتین دے کر جائے گا۔ چنانچہ  
 مہنگو جب صبح و شام بھی سانسے رکھ کر اپنے دھن یا پونجی کا میزان  
 لگاتے تو گھڑی، کبیل اور جھونپڑی کے علاوہ، جس میں اب وہ رہتے  
 تھے، دوہی چیزیں اور یاد آتیں۔ بیس آنے کا تینتر اور دانت کھودنے  
 والی اُن کے گلے میں لٹکی کھودنی جس کی قیمت چاندی کا بھاؤ گھٹ  
 جانے سے اب بیس پیسوں سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن اب بھی  
 ہر سال دیوالی کے دوسرے دن صبح کے وقت گوبر سے اندر کا برآمدہ  
 لپ کر بھی لے کر وہ بیٹھتے تھے اور کسی سادہ پتے پر روکڑ کے کھاتے  
 میں انھیں پانچ چیزوں کا اندراج کر لیتے تھے۔

دیوالی سے پہلے دسرا آتا ہے اور دسرا کے دن صبح کو گاؤں  
 کا چڑی مارا اب بھی مہنگو کو نیل کنٹھ دکھانے لاتا تھا۔ اس لئے آج دپہر

مک وہ چڑھتا رہا کی راہ دیکھتے رہے۔ لیکن جب دن گذر گیا اور چڑھتا رہا نیل کٹھہ دکھانے نہیں آیا تو شام تک منگو بہت اُداس ہو گئے۔ جب دن ڈوبنے سے پہلے چھپتر کے بانس میں سے تیتز کا پنجر اُتار رہے تھے تو اُنھوں نے محسوس کیا کہ جیسے کمر میں سکت نہ رہی۔ پنجر اُتارتے وقت جانگھیں کا پنے لگیں۔

ایک ہاتھ میں پنجرہ اور دوسرے میں سوٹالے کر جس وقت وہ مکان سے باہر نکلے تو سامنے کے درخت پر سے ایک نیل کٹھہ ”قیں“ قیں“ کرتا سیدھے زمین پر آیا۔ منگو ساہو کے پیر رک گئے۔ لیکن چونکہ دریا جانا تھا اس لئے اُس بدشگون کے باوجود گئے۔ راستہ بھر یہی سوچتے رہے کہ دسہرے کے دن شام کے وقت نیل کٹھہ اوپر سے اُڑ کر نیچے کیوں آیا۔ اُسی وقت کھیڑ رنج کا ہاتھی کے مستک کی اونچائی سے اُڑنا بھی یاد آیا۔

دریا کے کنارے ملاحوں کے ساتھ دو حلیم گا بچہ پن کر جب وہ بابو صاحب کے ہاتھی کا سیلاب میں بہہ کر مرنا بتا رہے تھے تو تیسری حلیم کا دم کھینچتے کھینچتے جیسے اُن کا دم چھوٹ گیا۔ ہوش کھوتے کھوتے اُنھوں نے ایسا محسوس کیا جیسے دریا کے اُس پار درارے میں سے جو اُوڑا تھا اُس کی آواز اُن کے کانوں میں ”کھڑ رنج کھڑ رنج“

کہ رہی تھی۔

ملاحوں کی پریشانی دیکھ کر کوٹ قبض پہنے ہوئے بابو، جو اسی وقت کشتی سے اترے تھے آگئے۔ جس وقت وہ منگو سا ہو کی نبض دیکھ رہے تھے اُن کی نظر منگو کی گھڑی کی چین پر پڑی۔ نبض ہلکی چل رہی تھی اس لئے منگو کی گھڑی ہاتھ میں لے کر نبض گنتے لگے۔ لیکن جب سکڑ کی سوئی چلتی نہیں دکھائی دی تو اُنھوں نے گھڑی کان پر لگائی۔ ملاحوں نے بتایا کہ گھڑی بولتی نہیں لیکن وقت ٹھیک بتاتی تھی۔ جو گھڑی سیلاب ہی کے وقت سے بند تھی اُس کی گھنٹے والی سوئی کو آٹھ پر دیکھتے ہوئے بابو نے کہا۔ ”ہاں، اِس وقت تو وقت ٹھیک بتا رہی ہے۔“ جب نبض کی طرف اُنھوں نے دھیان دیا تو وہ بند ہو چکی تھی۔



# زندگی

اپنی پیدائش اور اُس سے پہلے کے واقعات سے میں اتنا ہی واقف ہوں جتنا آپ ہوں گے، یعنی بالکل نہیں ہوں۔ بس کچھ سنی سنائی بانیں ہیں، جن کا یقین اس وجہ سے کرنا پڑتا ہے کہ پیدائش کے موقع پر اس دلش میں عام طور سے یہی سب ہوتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جس کے وہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے اُس کے یہاں خوشی منائی جاتی ہے، سوائے ایک برادری کے جس کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ تو کتنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ میرے گھر میں بھی خوشی منائی گئی۔ یعنی تھالیاں بچیں، بندوق چھٹی، گانا بجانا ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ باوجود اس مستقل رونے کے کہ ملک کی آبادی بھنیکر شکل سے بڑھ رہی ہے، جب بیٹا ہوتا ہے، یعنی جب بیٹی نہیں ہوتی ہے، تو سبھی خوشیاں مناتے ہیں۔ چنانچہ میری پیدائش بھی میرے گھر والوں کے لئے نہایت ہی مبارک چیز تھی۔ یہی نہیں بلکہ، اگر گستاخی موات ہو تو، میں یہ بھی عرض کروں گا کہ میری پیدائش سے میرے گھر والوں کو جتنی خوشی ہوئی اتنی شاید آپ کی پیدائش سے

آپ کے گھر والوں کو خوشی نہ ہوئی ہو۔ وہ کیوں؟ اس وجہ سے کہ مجھ سے پہلے میرے سات بہنیں پیدا ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جب میرے والد کو لڑکے کی کوئی امید نہ رہ گئی تو انھیں مجبوراً دوسری شادی کرنی پڑی۔ لیکن جب دوسری شادی سے بھی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ زندگی اور اپنے دونوں سے مایوس ہو گئے۔ بیٹا، بیٹی میں کیا فرق، اور ویسے سوچئے تو بہت فرق ہے۔ بہر حال کہنے کا مطلب یہ کہ دونوں خدا کی دین ہیں، اور ان کی مرضی کوئی کیسے بدل سکتا ہے۔ پھر بھی آرزو منت تو ہو ہی سکتی ہے، وہ مانیں یا نہ مانیں۔ بلکہ کچھ دیوی دیوتا تو ایسے بھی ہیں جن کی ایک حد تک سفارش بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میرے والد نے بھی تیرتھ، برت کئے، سادھو، مہاتماؤں کے درشن کئے، چرن چھوئے۔ اور جب میں پیدا ہوا تو دسہرے سے یہ دن پہلے چودہ کالے بکروں کی چودہ گردنیں دیوی دُرگا کے چوتھے پر ایک ساتھ گرا دی گئیں۔

میری سواری کے لئے میرے والدین نے جو گاڑی خریدی تھی، جسے آپ اپنی زبان میں ”پریم“ کہتے ہیں، اس پر جاڑے کے موسم میں شام کے وقت بیٹھا بیٹھا جب میں شکر قند کھاتا تھا تو اپنے والدین کی صرف ایک یاد آتی تھی، یعنی جب میری والدہ کی لاش

گھر کے باہر نکالی جا رہی تھی تو میں زمین پر بیٹھا بھٹنے ہوئے چنے کھا رہا تھا۔ پتاجی کب مرے، یہ تو معلوم نہیں۔ ماں کا مزنا بھی بھٹنے ہوئے چنے کھاتے وقت تو معلوم نہ ہوا تھا۔ لیکن جب میرا چھوٹا بھائی میری گاڑی پر چرھنے اور میں نیچے اتر کر زمین پر چلنے لگا تھا تب یہ معلوم ہوا کہ ماما پتا دونوں مجھے بخیر بتائے ہوئے اس دنیا سے چل بسے تھے۔ عرض کہ سر منڈے بھٹے کہ اولے پڑے۔ والدین کی زمینداری پر دوسروں نے قبضہ جمائے۔ گھر میں جو تھا چور اٹھا لے گئے۔ کاسٹھ بنک کا سارا روپیہ چونکہ دور اندیش کاسٹھوں نے ایک ہی دن میں نکال لیا، اس لئے نہ پتہ چلا کہ کاسٹھ بنک رہا اور نہ میرے نام کا روپیہ۔ تعلیم میری ”کریا“ سے شروع ہوئی۔ مولوی صاحب جن کی تعلیم خود کیے ہانکنے سے شروع ہوئی تھی، جب ”مانقیما“ مجھے پڑھا رہے تھے تو اسی وقت بڑے زور کا پلیگ گاؤں میں آیا۔ اس لئے انگریزی پڑھانے کے بسانے ہم دونوں بھائی پکڑ کر شہر بھیج دیے گئے۔ ہم لوگوں کے شہر چلے جانے کے بعد مولوی صاحب پھر کیے ہانکنے لگے، اور آج بھی کیے ہانکتے اور فیون کھاتے ہیں۔

آپ کہیں گے جو زندگی اس طرح شروع ہوئی ہو، اُس سے زیادہ امید بھی کیا کی جاسکتی ہے۔ لیکن آپ کا ایسا سوچنا غلط

ہوگا، اس لئے کہ میری سمجھ میں زندگی امید کی محتاج نہیں ہوتی، کیونکہ زندگی خود امید ہوتی ہے جب امید نہیں رہ جاتی تو آدمی خودکشی کر لینا ہے۔ خودکشی کرنے والے کو دنیا پاگل کہتی ہے۔ لیکن میں کوئی پاگل تھوڑے ہی ہو گیا تھا۔ اس لئے چاہے آپ میرا دشوار نہ کریں، لیکن پھر کبھی میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میرے جینے کا سلسلہ جو اس طرح چل نکلا تھا وہ میرے والدین کی موت کے باوجود بھی، ویسے ہی بے روک چلتا رہا۔ سمجھ لیجئے بس ایسے ہی جیسے کیلا، پچھو اور بانس کی ستنائیں کیلا پچھو بانس کے بعد بھی چلتی رہتی ہیں۔ بہر حال میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ میری زندگی کا سلسلہ لگ بھگ ویسے ہی چلتا رہا جیسے شاید پہلے چلتا۔ اگر کوئی فرق تھا تو اتنا کہ پہلے شاید جوتے پن کر اسکول جاتا تو اب ننگے پیر جاتا تھا۔ کبھی کبھی مٹی کا تیل نہ ہونے سے لالین بھی نہ جلتی تھی۔ لیکن میں کوئی راما بن تھوڑے ہی تھا جو سڑک پہ جا کر میونسپل لمپ کے نیچے حساب لگاتا۔

بس پڑھتے رہے، پاس ہوتے رہے، فیل بھی ہوتے تھے۔ پاس ہونے کی خوشی ہوتی، فیل ہونے کا افسوس ہوتا۔ لیکن آج تو کچھ ایسا سوچتا ہوں کہ اگر اور فیل ہوا ہوتا یا ہمیشہ فیل ہی ہوتا

رہتا تو آج زندگی کے امتحان میں کم یا س ہونے کا شاید افسوس زیادہ نہ ہوتا۔ بہر حال پڑھتے تھے، لکھتے تھے، نہیں بھی پڑھتے لکھتے تھے۔ دونوں میں کچھ زیادہ فرق بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ کہا ہے، ”دن بھر بھیک مانگیے تب دیا بھر، نہ مانگیے تب بھی دیا بھر“ کچھ اسی قسم کا میرا پڑھنا لکھنا بھی تھا اور تقریباً اسی قسم کی میری زندگی بھی تھی۔ لیکن اصلی زندگی تو وہ تھی جو رات میں چار پائی پہ پڑ جانے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ بستر پر پڑا ہوں، آنکھیں بند ہیں، لیکن پیند نہیں آتی ہے۔ بہت بڑا بیچ ہو رہا ہے کبھی ہاکی کا ہے، کبھی فٹ بال کا۔ میں ہوں کہ گیند لے بھاگتا ہی جاتا ہوں، تالیاں بچ رہی ہیں، ہزاروں لاکھوں تالیاں۔ مارا دھڑاک سے، گول ہو گیا۔ سیٹی بچ گئی۔ کھیل کے میدان کے کنارے کنارے سینکڑوں ٹوپیاں، جوتے، چھلتے اور دڈے اچھلتے لگے کچھ لڑکوں نے دوڑ کر مجھے کندھوں پر اٹھالیا۔ دوسری ٹیلی، ہوتے ہوتے میں سو گیا۔

بہر حال ستاروں سے شرمناک کبھی میں رکا نہیں۔ سورج کو دیکھ کر ڈرا نہیں۔ بادلوں کی گرج سے میں گھبرا یا نہیں۔ آسمان کو دیکھ کر میرے جوصلے پست نہیں ہوئے۔ میں تھا کہ اپنی

زندگی کی شاہراہ پر چلتا ہی جاتا تھا۔ میں تھا اور میری زندگی تھی۔  
 کبھی پنڈت جو اہر لال نہرو کی طرح ہزاروں لاکھوں مردوں،  
 عورتوں کو اکٹھا کر کے لکچر دیتا تھا۔ کبھی دھیان چند کی طرح ہاکی  
 کھیلتا تھا۔ اور جو آگے بڑھا تو عمر ہی کا وہ بھی تقاضہ تھا جو کہیں کسی  
 سنان میں اکیلے چپ چاپ بیٹھ کر کسی کے تصور کو پیار کرنے  
 لگا۔ چپکے چپکے خاموش باتیں ہوتیں کبھی شہر سے دور جا کر ایک  
 کے درختوں سے اپنا بھید کہتا، چڑیوں کے گانے سنتا۔ بیٹھے بیٹھے  
 تنکے توڑتا اور جوڑتا۔ پھر کسی کے تخیل میں وہاں سے چل دیتا۔ قدم ہمیشہ  
 گھری کی طرف اٹھتے۔ اندھیری سنان سڑکوں پر جب ڈر لگتا  
 تو، گائتری، منتر پڑھنے لگتا اور اس طرح چلتا چلتا گھر چلا آتا۔  
 پڑھنے کا شوق تو سکینڈ ڈویژن، میں دسواں درجہ پاس  
 کر کے پیدا ہوا۔ اور پھر ”سکینڈ ڈویژن“ سے اتنی محنت ہو گئی کہ  
 ”فرسٹ ڈویژن“ کو کبھی بھول کے بھی نہ سوچا۔ پھر پڑھنا لکھنا  
 کیا ہو گیا کہ سیرھی کا پڑھنا تھا۔ ایک سیرھی پر چڑھ کے دوسری  
 سیرھی کے لئے قدم آپ سے آپ اٹھ جاتے۔ چنانچہ ان سیرھیوں  
 کا سلسلہ آج بھی ختم نہ ہوا، اور غضب تو یہ ہے کہ آج آپ سے یہ بھی  
 نہیں بنا سکتا کہ اس وقت دراصل ہوں کس سیرھی پر۔

غرض کہ بے ڈھنگی زندگی کا سلسلہ جس طرح شروع ہوا تھا اسی بے ڈھنگے طریقے سے چلتا رہا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے وہ سب کچھ ہوا جو دنیا میں ہوتا ہے۔ یعنی شادی ہوئی، اس لئے کہ وہ ہوتی ہے۔ شادی کے بعد وہ سب ہوا جو شادی ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ بیوی پا کر خوش ہوا، بہت خوش ہوا۔ ناخوش بھی ہوا اور بہت ناخوش ہوا۔ اور اگر آپ یہ پوچھیں کہ اب کیسے ہیں تو جواب دوں گا، بس یوں ہی ہوں، یعنی نہ خوش ہوں نہ ناخوش ہوں۔ زیادہ کہہ بھی نہیں سکتا اس لئے کہ بیوی کا ڈر ہے۔ لیکن اس میں بیوی کا بھی کیا قصور؟ شادی سے ہمیشہ خوش رہنے والے کو میں بالکل ایماندار آدمی بھی تو ماننے کو تیار نہیں۔ اور اگر آدمی ایماندار ہے تو پھر اس میں شے لطیف کی کچھ کمی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح میں اپنی شیروانی یا قلم سے ہمیشہ خوش یا ناخوش نہیں رہ سکتا ہوں اسی طرح اپنی بیوی سے بھی ہمیشہ خوش یا ناخوش نہیں رہ سکتا۔ یہی نہیں بلکہ میری دقت تو یہ بھی ہے کہ میں خود اپنے سے بھی ہمیشہ خوش یا ناخوش نہیں رہتا۔ یعنی کبھی اپنی شکل آئینہ میں دیکھ کر اتنی تسکین ہوتی ہے کہ بس مسکرا دیتا ہوں۔ کبھی اسی آئینہ میں اپنے کو دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ ناک کو آخر کیوں نہیں ہونا تھا؟

ذرا ادھر نہ ادھر۔ آپ شاید اس کی وجہ معدہ کی کیفیت بتائیں۔  
 آپ کی سمجھ کی بات ہے اس لئے میں اس میں ترمیم کرنے والا کون  
 ہوں۔ خیر میں کہہ یہ رہا تھا کہ شادی ہوئی، شادی کے بعد نوکری ملی، اس  
 لئے کہ اس وقت ملتی تھی۔ شادی کے بعد چونکہ بچے ہوتے ہیں اس لئے  
 بچے بھی ہوئے لیکن۔ لیکن کا یہ مطلب نہیں کہ بچے بڑے ہوئے۔  
 اس سوال یہ ہے کہ اگر بچے اچھے بھی ہوتے تو کیا کر لیتے۔ آخر میں نے ہی کیا  
 کر لیا جو یہ کچھ کر لیتے۔ پھر میں ان کا ہوں ہی کون جو انہیں اس طرح  
 ماپوں تو لوں۔ یہ پڑھیں گے لکھیں گے یا نہیں پڑھیں لکھیں گے۔  
 ہر حال کسی نہ کسی حالت میں جئیں گے اور جئیں گے بھی تو اپنے  
 واسطے، جس طرح میں اپنے لئے جیتا ہوں۔ دوسروں کے لئے یہ  
 جئیں بھی کیوں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ کچھ کر بھی سکیں گے۔ لیکن  
 اگر کبھی لیئے تو کیا کر لیں گے؟ جہاں تک کرنے کا سوال ہے، جیسے  
 کچھ میں نے کر لیا اور کچھ یہ کر لیں گے۔ اگر گھر کو آگ لگ نہ گئی گھر کے  
 چراغ سے تو بڑی بات ہوگی۔

خیر چھوڑئیے اس بے مطلب کی بکو اس کو۔ میں حال ہی کی اپنی  
 ایک آپ بیتی سناؤں۔

صبح کا وقت تھا۔ اخبار پڑھ چکنے کے بعد چاؤ پی پھر سوچا کہ

کام کر لوں۔ کچھ کیا بھی، لیکن زیادہ جی نہ لگا۔ اس لئے ارادہ کیا کہیں گھوم آؤں۔ تھلتا تھلتا اپنے دوست مستری صاحب کے وہاں پہنچ گیا۔ چونکہ ان دنوں بی بی ان کی میکے گئی ہوئی تھیں اس لئے بے دھڑک اندر چلا گیا۔ آنگن میں ان کا نوکر ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مستری صاحب بھنڈارے میں ہیں۔ سن کر کچھ تعجب ہوا، لیکن اپنے دوست کی زندگی سے واقف تھا اس لئے سوچا چلوں دیکھوں حضرت باورچی خانے میں آخر بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ اندر گیا تو دیکھ مستری صاحب قلعے کی بوریوں اور مشکوں کے درمیان ایک کونے میں بیٹھے کچھ مصروف سے ہیں۔ دیکھتے سے ایسے لگے جیسے آٹے کی گسو بوری میں گھسے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بدن پر سے آنا جھاڑنے لگے پوچھا۔ ”کو بھائی، خیریت تو ہے؟“ بولے ”کچھ نہیں، اتوار کا دن تھا سوچا دیکھوں غلہ وغیرہ کیا خرچ ہو گیا ہے کیا رہ گیا ہے۔“ ایک بوری پہ سیر ترازو رکھے تھے۔ انھیں نیچے رکھ کر اسی بوری پر میں بیٹھ گیا۔ چونکہ باہر سے آنے سے مگاہوں کی چکا چوندھ اب ختم ہو چکی تھی اس لئے اندھیری کوٹھری کی چیزیں صاف صاف نظر آنے لگیں۔ ان کے ہاتھ میں اینچ والی پٹری دیکھ کر پوچھا۔ ”آخر اس سے کیا کر رہے ہو؟ ڈالڈا کے دس پونڈ والے سن میں پٹری

ڈالتے ہوئے بولے ”دیکھ رہا ہوں کڑوا تیل کتنا رہ گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کڑوا تیل اینچ والی پٹری سے ناپنے لگے۔ اور میری نظر کو ٹھہری کی دیوار پر لٹکی ہوئی چیزوں کی طرف گئی۔ چاروں طرف صرف تھیلیاں لٹک رہی تھیں۔ کسی تھیلی پر ہلدی، کسی پہ مرچ، کسی پر نمک، تو کسی پر دھنیا۔ غرض کہ ہر تھیلی پہ کچھ نہ کچھ لکھا ہوا تھا۔ دریافت کرتے پر معلوم ہوا کہ جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے تھیلی میں سے وہ چیز نکال لی جاتی ہے اور اُس کی قیمت جوڑ کر اُسی وقت تھیلی میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس طرح جب تھیلی کی چیز ختم ہو جاتی ہے تو اُس وقت تک اُس چیز کی پوری قیمت اُس تھیلی میں اکٹھا ہو جاتی ہے۔ پھر اُسی قیمت سے وہ چیز اُسی مقدار میں بغیر کسی جھنجھٹ کے بازار سے منگوالی جاتی ہے۔

اس انتظام اور اہتمام کو دیکھ کر میں تو بھونچکا رہ گیا اور اتنا پریشان ہوا کہ کچھ دیر بات چیت کر کے پھر اُسے پاؤں گھر ہی لوٹا۔ دن اس طرح خراب ہوا تھا کہ اب کچھ نہ کرتے اور نہ سوچتے بنے۔ بار بار یہ خیال آئے کہ آخر اس آدمی نے بھی زندگی کو کس حوصلہ اور اطمینان سے ناپ تول لیا ہے گز، فٹ، اینچ اور روپیہ، آنہ، پائی سے۔ چنانچہ سارا دن زندگی اور اُس کی کامیابی اور ناکامیابی ہی کو

سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے کہ آخر یہ دنیا بھی کیا تماشا ہے۔ اس میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے، کیا ہونا چاہئے اور کیا نہ ہونا چاہئے۔ دن تھا دھن تیرس کا، یعنی دیوالی سے پہلے والی شام، جب ہندو برتن خریدتے ہیں اس خیال سے کہ اگر اُس دن برتن خرید لیں گے تو بقیہ سال گھر میں ایسی خوشحالی رہے گی کہ تین سو چونسٹھ دن برتن ہی خریدتے بیٹیں گے۔ غرض کہ لکشمی اس طرح گھر میں آجائیں گی تو سال بھر گھر سے باہر نہ جاسکیں گی۔ حالانکہ میں نے کبھی اس طرح اپنے گھر میں لکشمی کا داخلہ نہیں کرایا تھا لیکن مستری صاحب کی زندگی کو تمام دن سوچتے سوچتے ایسا اثر پڑا کہ شام کو بازار جانے کے لئے میں بھی تیار ہو گیا۔ جب بیوی سے برتن خریدنے کے لئے روپیہ مانگا تو اُنھیں بھی تعجب ہوا۔ روپیہ لے کر گھر سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ مٹے صاحب باہر کے دروازے سے کچھ لنگٹا ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ میں نے سوچا لکشمی کو لانے چلے تھے ہاتھ یہ لگے۔ اندر آ کر گاندھی ٹوپی سر سے اتار کر گُرسی پر اُنھوں نے ایک طرف پھینکی، شیروانی اتار کر دوسری طرف پھر میرے سامنے کھڑے ہو کر جیسے مجھے چڑھانے کے لئے زور زور سے کانے لگے۔

لائی حیات آئے، تھنلے چلی چلے اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے  
 چونکہ بوکا کافی آرہی تھی اس لئے میں نے سوچا، یا آج دوپہر  
 ہی سے ایک ادھہ 'پگ' جھاڑے ہوئے ہے۔ نوکر کو بلا کر پھر انھوں  
 نے پانچ روپے دئے اور تاکید کی۔ "ادھالانا۔ چونکہ دھن تیرس کو  
 برتن خریدنے کا تو صلہ اس طرح کر کر اہوا تھا اس لئے میں بھی بیٹھ گیا۔  
 لیکن اس درمیان میں میری دن بھر کی الجھن ایک مستقل ذہنی تڑپ  
 کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس لئے میں نے کچھ جھنجھلا کر پوچھا "کو  
 آج دن دھاڑے کسی کی جیب کاٹ لائے کیا؟" منے صاحب بولے۔  
 "دوست تم نے بھی زندگی کو پہچانا نہیں۔" پھر کانے لگے۔

زندگی مذاق ہے مذاق کو نبھائے جا

میں نے کہا۔ "وہ تو ہے۔ لیکن میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ  
 آخر تمہاری زندگی کیا ہے جو تم اس طرح لوگوں کے پیسے مارتے  
 پھرتے ہو؟ کل آپ نے مستری بیچارے کا نام بتا کر اس کے دست  
 کے دس روپہ مار دیئے۔ مجھے کئی بار مصیبت میں ڈال ہی چکے ہو۔  
 آخر کب تک اس طرح جیو گے؟ کب تک تم سوچتے ہو، تمہاری اس  
 'ادبی' زندگی کا بوجھ تمہارے دوست اٹھائے رہیں گے؟" منے  
 صاحب بولے۔ "یا بیٹھنے بھی دو گے یا لکیر ہی جھاڑتے جاؤ گے۔ اگر

میرا انا اچھا نہ لگا ہو تو کہو میں چلا ہی جاؤں؟۔  
یہ کہہ کر وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور ٹس ٹس کر گانے لگا۔  
کوئی جلا رہا ہے جیسے جا رہا ہوں میں  
اس طرح کچھ دیر گاتا رہا۔ میں بھی چپ رہا اور جب مٹے  
ٹھنڈ اپڑا تو میں نے کہا: ”بھائی مٹے، اگر کچھ دیر اپنی شاعری  
بند کر کے سنتو تو کہوں؟ ایک دم جیسے اچھل پڑا۔ ”کہو بھائی  
ضرور کہو، میں تو چاہتا ہوں کہ تم کچھ کہو۔ لیکن کہنے کے پہلے  
میری سن لو۔ تم شاید یہی کہو گے نا کہ میں بھی تمہاری طرح شادی  
کیوں نہیں کر لیتا اور گھر کیوں نہیں بسا لیتا۔ پھر میری بیوی  
مجھے صبح شام ٹماٹر کھانے کو دے اور میں اس وجہ سے ٹماٹر  
کھاؤں کہ ٹماٹر کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمہاری  
طرح دوسروں کو بے معنی لکچر پلاؤں، بے مطلب کتابیں لکھوں،  
پیسہ کماؤں اور اس طرح، تمہاری رائے میں، زندگی کامیاب  
بناؤں؟ لیکن یا میں اپنے کو اور دوسروں کو اس طرح دھوکا دے کر  
جینا نہیں چاہتا۔ میں صرف جینا چاہتا ہوں۔ زندگی کو کامیاب  
بنانا نہیں چاہتا۔ زندگی مجھے بالکل ملیا میٹ ملی تھی اور اسے  
میں ملیا میٹ ہی چھوڑنا چاہتا ہوں۔ دوست، زندگی کامیاب

یا ناکا سیاب نہیں ہوتی۔ زندگی صرف زندگی ہوتی ہے۔ زندگی کو گز، فٹ، اینچ سے نہیں ناپا جاتا۔ زندگی تھرما میٹر ہے۔ اسے ایک سو دو ڈگری بخار ناپ کر اتنا ہی افسوس یا خوشی ہوتی ہے جتنا ایک سو سات ڈگری بخار ناپ کر ہوتا ہے۔ یار، میری بات یاد رکھو۔ اگر تم نے بھول کر بھی زندگی کو کسی پیمانے سے ناپا تو زندگی کے ہاتھوں بُری طرح مات کھاؤ گے۔

اس طرح معلوم نہیں مئے کب تک بکتا رہا اور میں مستنٹا یا نہ سنتا رہا۔ اتنا یاد ہے کہ نوکر اُدھالا یا۔ مئے اُدھالے کر چلا گیا میں نے اُسے جانے سے روکا بھی نہیں پھر اس طرح معلوم نہیں کب تک میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ باہر سے کسی نے پکارا۔ میں چونکا۔ جب تک اُس آدمی کو میں اندر آنے کو کتا وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ گیر و بستر پہنے، دائرہ صی رکھائے، جھولی مالا لٹکائے، پنجابی آدمی کُرسی پر میرے بغل میں بیٹھ گیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا مہاتما جی ہاتھ دیکھتے ہیں۔ میرے دوست مستری صاحب نے انھیں میرے یہاں بھیجا تھا۔ چنانچہ بغیر زیادہ سوچے سمجھے میں نے اپنا ہاتھ اُن کی طرف بڑھا دیا۔ مہاتما جی میری، تھیلی اپنے ہاتھ میں لے کر غور سے کچھ دیر دیکھتے رہے۔ پھر بولے پچھ

یہ لائف لائن ہے“ میں نے کہا۔“ جی۔“ اور یہ ہیڈ کی لائن ہے۔“  
 میں نے کہا۔“ جی۔“ اُفد یہ ہارٹ لائن ہے۔“ میں نے کہا۔“ جی۔“ بیٹیا  
 تیری سب لائیں اچھی ہیں۔ تجھ کو بڑی اچھی نوکری ملے گی۔ شادی  
 بھی اچھی ہوگی۔ بچے جو ہوں گے بڑے بھالگمان ہوں گے۔ دولت  
 بہت آئے گی اور خرچ بھی ہوگی۔ اور تو ایک مکان بھی بنوائے گا۔  
 تیرے لڑکوں کی شادیاں اچھی ہوں گی۔“ میں نے پوچھا۔“ میرے  
 مرنے کا کوئی خطرہ تو نہیں ہے، مہراج۔؟“ باباجی چونکے، لیکن پھر  
 اپنے کو سنبھال کر بولے۔“ نہیں بچہ، ایسی بات نہیں۔“ اور پھر  
 وہ معلوم نہیں کیا کیا بکتے رہے۔ میں سوچ رہا تھا یہی تو زندگی  
 ہے۔ اسی کو زندگی کہتے بھی ہیں۔ باباجی بھی اپنی زندگی کامیاب  
 بنا رہے تھے۔ میں نے اندر سے ایک روپہ منگایا اور اسے پایا  
 جی کی مٹھیلی پہ رکھ دیا۔ اس طرح میری مٹھیلی کی جان چھوئی۔  
 باباجی اُٹھ کر چلے گئے۔ میں منے کی باتیں سوچتا رہا اور پریشان  
 ہوتا رہا۔ زندگی جو ہم سے لیتی ہے وہ دیتی بھی ہے۔ لیکن زندگی  
 کی شراب ہمیشہ ایک ہی پیمانے سے نہیں بنتی۔ پیمانے اکثر  
 بدلتے رہتے ہیں۔ شراب کی لذت بھی بدلتی رہتی ہے۔ یہ بھی سزا  
 بھی بدل جاتی ہے اور کبھی ہم خود ہی بدلے رہتے ہیں۔ لیکن اگر

زندگی کے ہاتھوں مات نہیں کھانا چاہتے ہو تو زندگی جو کچھ  
 تم سے لیتی ہے اُسے کھونا مت سمجھو اور زندگی سے جو تمہیں ملتا ہے  
 اُسے پانا مت سمجھو۔ اگر تم نے بھول کر بھی ایسا کیا تو زندگی کے  
 ہاتھوں بڑے بکوں گے۔ یعنی ٹماٹر ضرور کھاؤ لیکن اس لئے نہیں  
 کہ اُس سے تمہاری زندگی بڑھ جائے گی۔ بلکہ ٹماٹر اس لئے  
 کھاؤ کہ اُس کا رنگ تمہیں پسند ہے۔ لیکن اگر تم ٹماٹر اُس  
 کے رنگ کی وجہ سے کھاؤ گے تو تمہاری بیوی تمہارے کھانے  
 کے لئے صبح شام ٹماٹر نہیں لائے گی۔

شاید زندگی مجھے پرکھ رہی ہے۔ آج میں رُوئی دارنڈکے کا کوٹ اور  
 رُوئی دارتنگ مہری کا پانچامہ اور رُوئی دارکنٹوپ کی دونوں گھنڈیوں کو  
 گلے کے نیچے کھینچ کر باندھنا ہوں تب بھی وہ دھڑا کا بار بار سنائی پڑتا  
 ہے۔ اُس دھڑا کے سے ڈر لگتا ہے، میں سہم سہم جاتا ہوں۔ شاید یہ وہی  
 دھڑا کا ہے جو میری پیدائش کے وقت بندوق داغنے سے ہوا تھا۔  
 خوشی کے موقع پر بندوق کا جھوٹا نافر شاید اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ  
 اُس دھڑا کے کو سن کر میں زندگی میں پھر کسی اور آواز سے نہ ڈروں گا۔  
 لیکن آج اگر ڈر لگتا ہے تو اسی دھڑا کے سے، یعنی اسی جھوٹے نافر سے،  
 جو شاید میری زندگی ہے۔

# تلاش

زندگی کے ایک بیس اور سات سال گزار کر بہاری  
ایک ایسی چیز کی تلاش میں آج نکلا تھا جیسے پا کر اُس کی آتما چکار  
اُٹھتی، اب زندگی سے شکایت نہیں۔ چونکہ زندگی کے یہی  
ایک بیس اور سات اُس کی جوانی کے دن بھی تھے، اس لئے  
بہاری یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس قسم کے تجربوں سے وہ  
ایسا کچھ انجان تھا۔ اس کے برخلاف، اس سے پہلے جب  
جب اُس میں یوں ہی یا کسی چیز کی وجہ سے جذباتی بھوک  
کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے تب تب اُس نے اُسی یا کسی اور  
آگ سے کھیل کر اُن شعلوں کو بجھائے تھے۔ یوں جنسی پیاس  
بجھتی بھی کہاں ہے، کیونکہ اس پیاس کو بجھانے کے لئے  
آدمی کو اُس مُرّاب کا پیچھا کرنا پڑتا ہے جو شاید اُسے کبھی  
نہیں ملتا۔ مگر اکثر اُس مُرّاب کا پیچھا کرنے میں ہی وہ پیاس

لہ جاتی ہے۔ ویسے پیاس مکمل طور پر کبھی نہیں بچھتی۔ لیکن  
 دمی شاید تھک کر یا اپنی خواہش سے ہار مان کر ایسا محسوس  
 کرنے لگتا ہے کہ جیسے پیاس ہی بچھ گئی۔

لیکن اتفاق سے آج اپنے کو ایسے شہر میں پا کر، جہاں  
 چانے جانے یا کسی کی آنکھوں کا پیچھا کئے جانے کا ڈر نہ  
 ہو سکتا تھا، بہاری کے اندر ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی،  
 جسے وہ اندرونی یا باہری کسی بھی ڈر سے دبا نہ سکتا تھا۔ کبھی  
 بھی مکمل شخصی آزادی کا احساس ہی آدمی کو عجیب چیز بنا دیتی  
 ہے۔ چنانچہ آج جب بہاری نے اپنے کو اتنا آزاد پایا تو اس  
 حساس ہی نے اُسے اُس آزادی سے فائدہ اٹھانے پر مجبور  
 کر دیا۔ اُس نے بھی سوچا۔ آج تک جب بھی کبھی ایسا موقع ملا اور  
 اس وقت اُس کی سمجھ میں ایسے موقعے زندگی میں بہت کم آئے  
 تھے، تو اُس موقعہ اور اُس تجربہ کی ہمیشہ کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی  
 تھی۔ یعنی یا تو کسی نے اُس کو پریم کرنے پر مجبور کیا یا کسی کی  
 ولصورتی سے کھینچ کر اُس کو اُس مصیبت میں اپنے کو  
 ڈالنا پڑا تھا۔

لیکن آج ایسا موقع ہاتھ آیا تھا جب کہ خود کو ایک انجان

شہر میں پا کر وہ بغیر کسی ڈر یا سنکوج کے، آزاد ہو کر، اپنے رومانی جذبہ کے لحاظ سے کوئی ایسی چیز پسند کر کے چن سکتا تھا جو ہو جو ویسی ہی ہوتی جیسی اُس کی آتما نہ جانے کب سے تلاش کرتی رہی تھی۔ یعنی عام طور سے جس جس سے اُس نے آج تک پریم کیا تھا اُن میں سے کسی کی آنکھیں اچھی تھیں تو کسی کی شکل اچھی تھی۔ لیکن جس کا رنگ صاف تھا اُس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اُس کا دل بھی صاف ہو یا جس کے ہونٹھ اچھے ہوں اسکی ناک بھی خوبصورت ہو۔ یعنی جب جیسی ملی اُس کو ویسا اُس نے پریم کیا تھا۔ پریم کرنے کے لئے آخر وہ کسی کو گڑھ تو نہیں سکتا تھا۔ لیکن آج جب اُس کی جیب میں پیسے تھے تو بہاری کا من، اپنے کو اُس خوبصورتی کے بازار میں پا کر، سوچ رہا تھا کہ آج تو وہ اپنے پسند کے لئے کسی کو گڑھ بھی سکتا ہے ایسی حالت میں بہاری آج اپنی جنسی آزادی کے اڑنے ہوئے سپنوں کے پر کہیں سے باندھنا نہیں چاہتا تھا۔

اُس بھرے بازار میں جس آزادی سے بہاری قدم اٹھا کر چل رہا تھا اُس کو دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی اجنبی پر دیسی تھا۔ تنگ سرک کے کنارے کنارے دوکانیں سجی ہوئی

نہیں، جن کی روشنی میں راستہ چلنے والوں کے دلوں کی تاریکی بھی اُجاگر ہو جاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں چھوٹی چھوٹی بننے والی چیزیں بھری پڑی تھیں۔ خریدار بھی چھوٹے ہی چھوٹے تھے، یعنی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدتے اور آگے گزرتے۔ دو روپہ دوکانوں کے اوپر دو روپہ کوٹھے تھے۔ کوٹھوں کے چھجوں پر کہیں سے کسی کی ناک کی کیل جھلک اٹھتی تو کسی کی ساڑھی کے کنارے کا نقلی گوطا آنکھوں کو چکا چوند کر دیتا۔

اسی روشنی نیچے دوکانوں پر تھی اتنی دوکانوں کے اوپر کوٹھوں نہ تھی۔ بلکہ کوٹھوں کی تاریک دنیا میں صرف اتنی روشنی ہی کہ ناک میں کیل اور گوتے دار ساڑھی پہننے والوں کی ہلکی دکھائی دے سکتی۔ اور وہ شکلیں بھی دیکھنے والے سے اتنی ہی دیکھ سکتے تھے کہ یہ طے کر سکیں کہ کس کو بٹہ تاریک سیڑھی کو ٹٹولتے ہو۔ وہ اوپر چڑھ جائیں۔

کوٹھوں پر چڑھ کر ناکوں کی کیلوں کے جڑاؤ پتھر اور ساڑھی کے گونے نقلی یعنی سراب ثابت ہوتے تو یہ اس اندلی روشنی کا قصور نہ تھا جو راستہ دکھا کر لوگوں کو اوپر لے جاتی تھی۔ بلکہ وہ تو اس کوٹھے کی دنیا کا ہی قصور ٹھہرا

جو خود اکثر سراب ہوتی ہے۔

آخر اس طرح بہاری کب تک ٹہلتا رہتا۔ لیکن  
انجان کسی کوٹھے پر چڑھ بھی کیسے جاتا۔ زیادہ یا کم شکار  
تو دُور سے سب ہی چمکتے ہیں۔ بہر حال جب بہاری کچھ نہ  
طے کر سکا اور اس طرح لگ بھگ تین سو گز کی پیشانی  
سڑک، اس طرف سے اُس طرف اور اُس طرف سے  
اس طرف، ناپتے ناپتے وہ تھکنے لگا تو جیسے دماغ کو  
ٹیک دینے کے لئے وہ ایک پان کی دوکان پر ٹھہر کر  
پان خریدنے لگا۔ پان خرید رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔  
اتنے میں اوپر کوٹھے کی نیچی بلیسر پر سے جیسے کسی کی ریشمی  
ساڑی کا آچل نیچے کی طرف جھینٹا۔ آچل کے ساتھ  
بہاری کی نگاہیں کوٹھے پر کھینچ گئیں۔ ساڑی کا آچل  
کندھے پر چلتے ہوئے کوئی بلیسر پر سے سُکرا رہا تھا۔  
اتنا اشارہ پا کر کوئی کوٹھے پر کیوں نہ چڑھ جاتا۔  
پچاننے والوں کے واسطے آدمیوں کے ارادے اُن کے  
چہروں پر لکھے ہوتے ہیں۔ پان والے نے  
جھک کر ادب اور لحاظ سے پان دیتے ہوئے دوکان

کے داہنی طرف والی تاریک گلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔  
 ”سیڑھی آگے ہے۔“

اب یہاں سوچنے سمجھنے کا موقع کہاں تھا۔ جو کچھ سوچنا سمجھنا  
 تھا وہ تو بہاری گھر سے سوتج کر آیا تھا۔ چنانچہ جب تک وہ  
 ادھی سیڑھی ملے کر پایا تھا اُس نے دیکھا دیا سلائی کی تپتی جلا کر  
 اوپر سے کوئی اُس کا راستہ روشن کر رہا ہے۔ دیا سلائی کی روشنی  
 سے تنگ اور اُدھر کھاڑے سیڑھیوں کا راستہ بہاری کے لئے  
 روشن بھی کیا ہوتا۔ لیکن دیا سلائی کی ایک تپتی جو کام کر سکتی تھی  
 اتنا اُس نے کیا۔ یعنی اُس روشنی سے راستہ دکھانے والے کی  
 کلیموں سے لیکر منہ اور ناک کے نیچے تک کے حصے ایک لمحہ  
 کے لئے روشن ہو گئے۔ بہاری اپنی منزل اتنی نزدیک دیکھ کر  
 کوٹھے پر کیا پہاڑ پر چڑھ جاتا۔ لیکن جب وہ سیڑھیوں سے  
 گزر کر داہنی طرف کو مڑتا تو اُس نے اپنے کو ایک برآمدہ میں  
 پایا جو بغل کے روشن کمرہ کی روشنی کا محتاج تھا۔ برآمدہ میں  
 جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا اُس کے سامنے جیسے ایک  
 خوبصورت بہت پیچھے ہٹتا جاتا تھا۔ بہاری اُس چلتی ہوئی  
 تصویر کا سامنا کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا اگر اسی وقت اُس کی

نظر اُس آدمی پر نہ پڑتی، جو بغل کے روشن کمرہ میں ایک کنارے بیٹھا تھا۔ کُرسی پر آدمی کو اُس حالت میں دیکھ کر بہاری کے تو ہوش اُٹ گئے۔ وہ کمرہ کے ایک کونے میں جہاں روشنی نہیں کے برابر تھی، ایک کُرسی پر تنگے بدن اپنے سارے کپڑے لٹے اپنی جانکھوں پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا۔ کُرسی کے بغل میں دیوار سے ٹھہری ہوئی ایک بید کی پتلی چھڑی رکھی تھی، جس کی مٹھیا چاندی جیسی چمک رہی تھی۔ بہاری نے جب آدمی کی گود میں پوری فوجی وردی کو گٹھری بنے دیکھا تو اُس نے سوچا سپاہی شاید کوئی پنجابی زنگر وٹ ہے۔ لیکن اور آگے بڑھ کر اُسے اپنے اُس خیال کو کاٹنا پڑا، جب اُس نے دیکھا کہ ننگا سپاہی افسروں جیسی ٹوپی بھی سر پر پہنے بیٹھا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ پریشانی بہاری کو جس خیال سے ہو رہی تھی وہ یہ تھا کہ سپاہی جاندار تھا یا بغیر جان کے اُس کُرسی پر کاٹھ کے کھلونے کی طرح بیٹھا ہاں رہا تھا۔ اُس کو دیکھ کر اُس وقت جو دوسری تصویر بہاری کے دماغ میں آئی وہ ایک فوجی افسر کی تھی جو ہندوستان کی سرحد پر کہیں بیٹھا ملک کی بچاؤ کر رہا ہو۔

جس اندرونی دہشت اور ذہنی پس و پیش میں وہ اُس وقت پڑ گیا تھا وہ بیماری کو نہ وہاں سے آگے بڑھنے اور نہ پیچھے مٹنے دیتے تھے۔ اُسی وقت اُس کی نظر جب اُس خوبصورت لڑکی کی طرف گئی تو اُس نے دیکھا کہ وہ اُسے اُننگلی سے اشارہ کر کے اپنی طرف بٹلا رہی ہے یہ تو ظاہر ہی ہے کہ بیماری ایسی جگہ آکر پھنسا تھا کہ آگروہ اب اُس لڑکی کے اشاروں پر نہ چلتا تو کیا کرتا۔

چنانچہ اُس لڑکی کے ساتھ وہ بغل کے کمرہ میں داخل ہوا۔ لڑکی نے اُسے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا اور خود مونچ اور سرکنڈے کی نیچی مچیا پر بیٹھ گئی۔ کچھ لمحہ خاموش رہنے کے بعد لمبی لمبی گوری بانہوں پر سے پھسلتی ہوئی سیلک کی ساڑھی کو چن کر کندھے پر ٹھیک کرتے ہوئے لڑکی نے پنجابی لہجے میں پوچھا۔ کتنی دیر رہے گا؟ بیماری جس اُلجھن میں پڑا تھا اُسے وہی جانتا تھا۔ چنانچہ اس سوال کو سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اُس کا کھڑا ہونا تھا کہ اُسے بغل کے روشن کمرہ میں کھونٹی پر لٹکا ہوا وہ اور کوٹ نظر آیا جس کے کندھے پر پیتل کا بنا ہوا بادشاہ سلامت کا تاج

چمک رہا تھا پنجابی لڑکی نے فوراً کہا۔ ”نہیں نہیں۔ بیٹھے  
آپ۔ میرا مطلب یہ تھا کہ کتنی دیر رہیں گے آپ؟ رات  
بھریا؟“

بھاری کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن اب اس کی سمجھ میں نہ آئے  
کوہ کیا کرے اور کیا کہے۔ بغل کے کمرہ میں تنگے سپاہی کا ڈر  
اُسے مارے ڈالتا تھا۔ حسین پنجابی لڑکی کا کاروباری سوال  
اُسے مویشیوں کا سوداگر بنائے دے رہا تھا۔ مکان کی خاموشی  
مکان کے ہر کونہ سے ”قتل قتل“ پکار رہی تھی۔ لیکن میاں سے  
بھاگنا بھی تو ممکن نہ تھا۔ اس لئے بھاری نے ہوش ہو اس  
درست کر کے سمجھ سے کام لینا چاہا۔ ”آپ کو میرے ساتھ باہر  
چلنا ہے۔“ مگر جب اس نے دیکھا کہ اس سوال کا بھی کوئی  
اثر خوبصورت تندرست گوری جی لڑکی پر نہ ہوا تو اس نے  
سمجھا کہ صورت ضرورت سے زیادہ خراب ہے اور جس  
وقت وہ وہاں سے نکلنے کو سوچ رہا تھا تو سپاہی اپنا سارا  
سامان اور چھڑی لئے کھڑا ہوا اور کمرہ کے باہر نکلا۔  
لڑکی نے موقع پا کر بھاری کے نزدیک ہو کر کہا۔ ”نہیں،  
میں میاں سے باہر نہیں جاسکتی۔ اگر آپ چاہیں تو ہمیں

تھوڑی دیر۔ پھر اُس نے باہر سپاہی کو جھانک کر دھیرے سے کہا۔ ”ابھی یہ۔۔۔“ فوجی سپاہی کمرہ کے باہر تھوک کر اُسی وقت اندر لوٹا۔ اُس کے فوجی بوٹ جوتے کی کھٹ کھٹ آواز میں پنجابی لڑکی کی دھیمی آواز کھو گئی۔ کمرہ میں آگر سپاہی اپنے بید سے دروازہ پر مارنے لگا۔ بہاری نے ڈرتے ڈرتے سوچا۔ اب بھی بھاگ چلو ہیاں سے ورنہ خیریت نہیں۔

جس وقت بہاری کرسی چھوڑ کر چلا، لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ ”پھر کبھی آئیے گا، پانچ روپیہ۔“ پورا جملہ بہاری نہ سن سکا اور نہ لڑکی نے کہا۔ اُس وقت وہ سپاہی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ سپاہی کیل دار بھاری بوٹ جوتے پہنے اپنی وردی وغیرہ گود میں سمیٹے بید جوتے پر کھٹ پھٹاتا ہوا کمرہ میں ٹہل رہا تھا۔ جس وقت تیزی سے بہاری میسر ٹھیوں پر اندھیرے میں پسینھا لتا ہوا اتر رہا تھا تو وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اگر سپاہی اپنی وردی اور کپڑے اپنے ساتھ نہ لے رتا تو بھی سپاہی آخر سپاہی کیسے کھلاتا۔ لیکن بہاری کو دراصل تعجب تو اس بات پر ہوا کہ وہ جس احتیاط سے اپنی جان سمیٹے ہوئے

تھا سپاہی اتنے ہی احتیاط سے اپنے فوجی کپڑے اپنی جان سے سمیٹے ہوئے تھا۔ بیماری جانیچے اتر کر، گلی سے باہر نکل کر، پھر سڑک پر چلنے لگا تھا اُس وقت وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ بھی ٹھیک ہی تھا۔ سپاہی اپنی جان کھو کر بھی سپاہی ہی رہتا، لیکن اپنی وردی کھو کر وہ کچھ بھی نہ رہ جاتا۔ اس لئے تھکا ہوا سپاہی جس وقت کرسی پر بیٹھا تھا اُس وقت اُس کو جان سے پیاری اُس کی وردی تھی۔ لیکن جان کی سوچتے وقت بیماری کو جب اپنی جان کا خیال آیا تو اُسے اس کا یقین نہ ہوا کہ وہ دراصل سیڑھیوں پر سے اتر کر نیچے آیا تھا یا سیدھے کوٹھے پر سے کود پڑا تھا۔

کچھ آدمیوں میں یہ خوبی یا خرابی ہوتی ہے کہ وہ ایک بار گر کر بار بار گرنا اور اٹھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بیماری اُن گلیوں اور سڑکوں پر ایسے ہی بھٹکتا اور پھرتا رہا، جیسے آدمی جب ایک بار جینے کو طے کر لیتا ہے تو اُس کے بھلے برے کو نہ سوچ کر دکھ سکھ سہتے ہوئے جیون کی پگڈنڈیوں پر پھرتا اور بھٹکتا رہتا ہے۔ آدمی اکثر یہ بھی تو نہیں جانتا

کہ وہ آخر کر کیا رہا ہے۔ اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر وہ یہ بھی جان جاتا ہے کہ وہ بُرا کر رہا ہے تو آسانی سے یہ نہیں طے کر سکتا کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے تو اور کیا کرے۔ راستہ چلتے وقت اگر ٹھیس لگ جائے تو آگے جانے کا ارادہ چھوڑ کر واپس کم ہی لوٹ آتے ہیں۔ چنانچہ یہ نہ جانتے ہوئے کہ اب وہ کیا کرے بیماری اسی سڑک اور اُسکی داہنے بائیں روشنی اور بخیر روشنی کی گلیوں میں مارا پھرا۔ اسی وقت چوراہے کے نزدیک اُسے کچھ بھیر ڈکھائی دی۔ جو تماشہ دیکھتے ہیں وہ ہمیشہ بیکار ہی نہیں ہوتے۔ لیکن اگر بیکار تماشہ دیکھے تو کیا کرے۔ خالی دماغ دیر تک خالی بھی تو نہیں رہ سکتا۔ تماشے سب ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن تماشہ دیکھنے والے سب ہی ہوتے ہیں کیونکہ دنیا کی اور چیزوں کی طرح آدمی کا دماغ بھی دیر تک خالی نہیں رہ سکتا۔

زردیک پہنچ کر بیماری نے دیکھا کہ بھیر بڑھتی جا رہی تھی۔ بیچ چوراہے پر ہو کیا رہا تھا وہ دور سے نہیں بتا سکتا تھا۔ چنانچہ اور نزدیک جا کر اپنی اونچائی سے قائدہ اٹھاتے ہوئے ایڑی اٹھا کر اُس نے بھی دیکھا اور حیرت سے دماغ چلک

کھا کر رہ گیا۔ چاروں طرف سے تماشہ دیکھنے والے ایک تنگ دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ بیچ چوراہے پر ایک میلے بدن کا لڑکا سیلی لنگوٹی پہنے زمین پر اُکڑوں بیٹھا اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مہاجن کا جو ان لڑکا ریشمی واسکوٹ میں گھڑی کی سونے کی چین لٹکائے چاندی کی مٹھیا کی ہلکی چھڑی ہو ایس گھماتا ہوا لڑکے سے کہہ رہا تھا کہ اگر وہ زمین پر سے چاندی کی چوٹی زبان سے جھک کر اُٹھالے تو چوٹی اُس کی ہو جائے گی۔ لڑکا چونکہ لوگوں کی للکار میں آکر زبان سے چوٹی اُٹھانے کو تیار ہو گیا تھا اس لئے مہاجن کے بیٹے نے دولت کی نمائش کرتے ہوئے اپنے منی بیگ میں سے ایک چاندی کی چوٹی نکال کر زمین پر پھینکی اور گھنڈ سے مسکراتا ہوا اوپر کوٹھے کی طرف دیکھنے لگا۔ اب جو باری کی نظر بھی اوپر گئی تو تماشے کی صحیح وجہ اُس کی سمجھ میں آئی۔ نتھ پہنے گوبے رنگ کی لڑکی بیچ مہاجن کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ اسی طرح دوسرے کوٹھوں پر سے لڑکیاں، نتھ یا بغیر نتھ کے، نیچے سڑک پر تماشہ دیکھ رہے تھے مہاجن کی دولت اور نتھ والی لڑکی پر رشک کر رہی تھیں۔ اتنے میں زور سے تالی بھی اور معلوم ہوا کہ لڑکے کے منہ کی رال

نے لڑکے کی قسمت کی مدد کر دی اور اُس نے سڑک پر سے زبان سے چوٹی اُٹھالی۔ جس وقت مہاجن کا لڑکا کھسیا یا ہوا دوسری چوٹی زمین پر پھینکنے کے لئے اپنا سنی بیگ کھول رہا تھا، بیماری کو اس بُری طرح متلی آئی کہ وہاں سے پریشان ہو کر وہ چل دیا۔ وہاں سے چل دیا اور چلتے چلتے اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ کون کئی تھہ والی عورت کے اُس کینے ہیں پر جو مہاجن کے نوٹس کو شہہ دے کر اُس سے ایسا ذلیل کام کر رہی تھی۔

چلتا جا رہا تھا اور پیسے کی جابر حکومت کو سوچتا جاتا اور اُس پر پریشان ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بیک سامنے سے ایک آدمی آنا دکھائی دیا جو جانا پہچانا سا معلوم ہوا۔ بیماری نہ اُسے ایک دم پہچان سکا اور نہ یہ طے کر سکا کہ کس طرح بغل کی گلی میں کتر اکر اُس آدمی سے جان پچائے۔ اور جب تک یہ طے کر سکتا کہ وہ کون ہے سعید نے سامنے اکر اُس کا راستہ روک دیا اور نہ بیماری تو آنکھ پچا کر نکلا ہی جا رہا تھا۔

اب جو بل گئے تھے تو اچھی طرح ملے۔ اور پھر ایسی جگہ بل کر اگر اس طرح نہ ملتے بھی تو کیا کرتے۔ بیماری نے پھر یہ

بھی سوچا کہ رات کے اُس وقت وہاں ہونا اُس کے لئے شاید  
 اتنا ہی معیوب ہو سکتا تھا جتنا سعید کے لئے۔ بہر حال سعید کو  
 تعجب ضرور ہوا بیماری کو وہاں پا کر۔ لیکن ماں کا دودھ اُس  
 نے آج ہی تو چھوڑا نہ تھا جو بیماری سے بقیہ پروگرام پوچھتا۔  
 چنانچہ سامنے کی دوکان پر دونوں چار پیتے رہے اور دیر تک  
 ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر جو دونوں اٹھے تو سیدھے  
 اُس گلی میں گئے جو مشہور تھی 'جدن' کی گلی کے نام سے  
 لیکن رہتی تھی جہاں اب روپ کٹور۔

پھر ویسی ہی گلی اور وہی تاریکی۔ ویسے ہی تنگ نیچی اونچی  
 سٹرھی کے زینے۔ اور سٹرھی کے اندر اور سٹرھی کے اوپر  
 وہی روشنی کی کمی۔ لیکن ہزار مصیبتیں سہی اوپر تو جانا ہی تھا  
 کیونکہ کوٹھے کے اوپر روپ کٹور رہتی تھی، جو جدن کی پوتی  
 تھی۔ جدن بانی کا جو زمانہ تھا اُس کے بارے میں کس نے  
 نہ سنا تھا۔ چار کی دوکان پر سعید نے بیماری کے کان کے  
 پاس اپنا منہ لیجا کر بتایا تھا کہ ایک زمانہ تھا جب جدن کے  
 وہاں نوابوں کا آنا جانا تھا۔ اُس کے بارے میں لوگ  
 یہ بھی کہتے تھے کہ اُس کا بچپن نواب واجد علی شاہ کی ڈیوڑھی

کے اندر گزرا تھا، اس لئے کہ اُس کی ماں نواب صاحب کی خاص لونڈیوں میں سے تھی۔

تو جس جَدَن بانی کی گدی پر روپ کنور بیٹھی تھی وہ کوئی ایسی ویسی تو کیا ہوتی۔ بہاری نے سعید کی باتوں سے یہی نتیجہ بھی نکالا تھا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا رہا کہ شیرنی نے کوئی گیدڑنی کو تھوڑے ہی دو دھ پلا یا ہوگا۔ اور جب سعید نے یہ سب کہا تھا تو بہاری یقین بھی کیسے نہ کرتا۔ آخر سعید بھی تو وہی کہتا ہوگا جو اُس نے دوسروں سے سنا ہوگا۔ اور سعید کوئی ایسا دوست تو تھا نہیں جو قصے گڑھ کر سنا تا۔ پھر طوائفوں کے بارے میں یہ بھی کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ کیا بیخ اور کیا جھوٹ ہے۔ لیکن بہاری کو سعید پر اعتبار تھا صرف بحیثیت ایک دوست ہی کے نہیں بلکہ اُس سے زیادہ بطور ایک تجربہ کار اور دنیا دیکھے اور دنیا سے کھیلے ہوئے نوجوان کے۔

چنانچہ کھلے ہوئے برآمدہ سے ہو کر سعید اور بہاری جس وقت روشن کمرہ کے سامنے کھڑے ہوئے تو کمرہ میں ٹہلتی ہوئی بیس بائیس سال کی خوبصورتی نے اُن کا استقبال کیا۔ آگے آگے سعید تھا اور بہاری اب محض سعید کی پیروی کر رہا تھا۔ چنانچہ

سعید کے پیچھے کھڑے کھڑے بہاری نے سعید کے کندھے پر سے ایک نظر کمرہ کی رانی کو دیکھا۔ دیکھا اور پھر یہ طے نہ کر سکا کہ وہ عورت تھی یا کوئی جادو کی پتلی تھی۔ سعید بڑھ کر کمرہ میں چلا گیا اور اندر جا کر اُس نے بہاری کو اندر بلایا۔ آداب اور تکلف کے بعد دونوں دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ خود تخت پر چڑھ کر مٹھی اور پاندان گھسیٹ کر چھالیا کاٹنے لگی۔ بہاری جس پریشانی سے مراجارہا وہ یہ تھی کہ سعید کی اُس سے جان پہچان ہوتے ہوئے بھی دیکھ کر دونوں ایک دوسرے سے کچھ کھینچے کھینچے سے ہیں۔ سعید چپ سگریٹ پیٹا جارہا تھا اور جیسے ساٹھ ساٹھ اپنے جذبات پر قابو پانے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر چھالیا کاٹنے کے بعد اُس نے داہنی آنکھ کی اوپر کی پلک اٹھا کر شرارت سے ایک ترپھی نظر سعید کو جیسے تریر کے دیکھا اور پھر دوسری ڈلی اٹھا کر کاٹنے لگی۔ بہاری اُس کی کالی ساڑھی پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ رہا تھا اور اندر ہی اندر اُس کا دل اس خیال سے جھللا رہا تھا کہ اتنی دیر آئے ہوئے اور اُس نے اُس کی طرف توجہ بھی نہ کی۔ جس رُخ وہ بیٹھی تھی بہاری اُس کا پورا چہرہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کنارے سے آنکھ ناک،

ہونٹھوں اور ٹھڈی کا بس ایک نقشہ جیسا اُس کی آنکھوں میں  
سمایا جاتا تھا۔

اتنے میں اپنی جگہ سے اٹھ کر سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا اگلا دلان  
میں جھک کر ڈالتے ہوئے سعید نے بہاری سے کہا: "چلو بھائی،  
چلتے ہو ہیں تو چل دیو۔" اسی وقت کالی ساڑھی کی پری نے مڑ کر  
بہاری کی طرف ایک اطمینان کی نظر سے دیکھا اور ہلکی سکرانٹ  
کے ساتھ اُس کے اوپر نگاہیں جمائے ہوئے پان کی سرخی زبلیں  
سے اپنے ہونٹھوں پر آہستہ آہستہ پھیلانے لگی۔ بہاری جو  
گرمی چھوڑ کر اٹھنا چاہتا تھا اُس کو جیسے وہیں کسی نے کاٹھ  
لہر دیا ہو۔ اور اُس ایک لمحہ میں اُس کے اور بہاری کے درمیان  
خوبصورتی کے ساتھ ملی ہوئی مخرافت کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی کہ  
جیسے اُس کے بدن میں بیٹھی بیٹھی امیروں کی لکیریں رینگ  
رینگ کر اُس کے اندر پھریں یاں پیدا کرنے لگیں۔ سعید نے کمرہ  
کے باہر پہنچ کر جو گھوم کر دیکھا تو اُس سے معلوم ہوا کہ دشمن نے  
اپنا ہی سپاہی پھوڑ لیا تھا۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس  
بہاری کو بھی ہوا۔ چنانچہ شطرنج کی بساط پھیلی دیکھ کر اُس نے  
اس چاکہ پہلی چال وہی چل کر دیکھے۔

”آخر ایسی جلدی بھی کیا ہے یا۔ آؤ تھوڑی دیر بیٹھو نا پھر چلیں گے۔“

”تم چاہو بیٹھو۔ میں ایسی جگہ بیٹھنے سے رہا۔“  
 ”تو تم جاؤ نا۔ آخر تم سے کتنا کون ہے بیٹھنے کو؟“  
 بڑے جو آئے ہو وہاں سے تنکے۔“

اب تو بہاری لال کے ہوش درست نہ رہے۔ اُس نے دیکھا یہ تو بات کا تنگڑ ہو گیا۔ لیکن سعید کب اس چوٹ کو خاموش رہ کر برداشت کر سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے کمرہ میں لوٹتے ہوئے جیسے آگ ہی تو لگا دی ”دیکھو جی، تمھاری جیسی لونڈیوں نے تم نے بہت دیکھی ہیں۔ میرے پاس جب تک پیسے ہیں دس ملیں گی تمھاری جیسی۔“

”واہ رے پیسے روپے والے جو چلا ہے پیسے دکھانے چل چل کہیں اور جا، جو تیری ہوا میں آئے۔ یہاں تمھارے جیسے جو تیاں پٹتے ہیں۔“

”آپیٹ تو جو تیاں، دیکھوں میں ذرا“ سعید  
 کرسی پر بیٹھا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”چپڑیل  
 کہیں کی“

ہماری اپنی جگہ سے اٹھ کر تخت اور سعید کے درمیان آگیا اور  
 بیچ بچاؤ کرنے لگا۔ لیکن چونکہ فریقین نے شروع ہی میں بات  
 حد تک پہنچا دی تھی، اس لئے بات زیادہ آگے بڑھنے سے  
 جلد ہی ٹرک ٹھہری۔ پھر دونوں خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔ ہماری  
 نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور دونوں کو سگریٹس  
 پیش کرنے لگا۔ جھگڑے کے ایک فریق نے تو اپنے زمانے  
 ادب اور خلوص سے شکریہ ادا کر کے ہماری سے سگریٹ  
 لے لیا۔ لیکن دوسرے فریق یعنی سعید نے اس بہانے سے  
 معافی مانگ لی کہ وہ ابھی ابھی پی رہا تھا۔ خیر، ہماری نے  
 بھی سوچا کہ کسی ایسی بات پر ابھی زور نہ دینا چاہئے جو  
 جھگڑے کی کسی طرح یا تنازعہ کر دے۔ سعید جیب سے اب  
 بیٹھا سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی بڑی تصویر کے برقیٹلے سر  
 اور اس میں پھمنے ہوئے بارہ سنگھے کی پریشانی اور بچاؤ کی  
 کورفیکانہ نظر سے دیکھتا رہا اور اپنے کو اس دور دراز برقیٹلے  
 دنیا میں پا کر مغلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔ ہماری نے ٹوٹے  
 پھوٹے جملے جو مٹے مٹے آن سے جھگڑے کی پوری صورت  
 اور تصویر اپنے دماغ میں مکمل نہ کر کے حیرت کرتا رہا سعید کی

حماقت پر۔ آخر اُسے بھی کیا سنک سو بھی تھی جو بات اس حد تک بڑھادی۔ اگر چاری خود کسی اور کے واسطے تھک ہو چکی تھی تو ایک ہی ساتھ دو جگہوں پر یعنی سعید کو بھی کیسے خوش کر سکتی۔ اور پھر دس روپیہ اور پانچ روپیہ میں کیا فرق؛ لیکن اس کا بھی کیا یقین۔ اپنے اپنے پسند کی بات ہے۔ کمرہ کے اندھیرے میں سعید کو آخر کیا معلوم ہو سکتا تھا کہ دراصل وہ دس یا پانچ روپیہ لائق تھی۔

بہر حال اس طرح وہ سوچتا رہا اور من ہی من میں جتنا سوچتا اتنا ہی سعید کو غلط پاتا۔ بیٹھے بیٹھے بار بار اُس کی نظر میں تخت کی رانی سے ایک ہو جاتیں اور نگاہوں کے ایسے مختصر بلن میں نوابوں کی ڈیوڑھی میں پکی جَدن کی پوتی حُسن اور عشق کے وہ خاموش پیغام بھاری کے کانوں میں سُنادتی کہ اُس کی اُنکھلیوں کی پوریں ٹوٹنے لگتیں۔ دھیرے دھیرے جب وہ اپنے اندر یہ طے کر رہا تھا کہ وہ یہاں سے اس طرح خالی ہاتھ نہ جائے گا تو سعید کے پیر بیک بیک فرش پر حرکت میں آئے، جیسے اُس نے بھاری کے من کی بات سُن لی ہو۔ لیکن جب اُٹھ کر وہاں سے اُس نے چلنا چاہا تو طوائف نے

ابکی اپنی ہی طاقت کا استعمال کیا۔ ابھی کیسے جاؤ گے؟ میں تو ایسے جانے نہیں دیتی۔ اب گانا سننے بغیر نہیں جاسکتے۔“

اس میں شک نہیں کہ جب یہ لفظ اُس کے مُنہ سے نکلے اُس وقت اُس کی نگاہیں سعید کے بجائے بیماری کی نگاہوں پر، کھونٹی پر سنہرے ہار کی طرح، لٹک گئی تھیں۔ اور اب جو بیماری کے دل کے گرد اُس حسین چڑیل نے جمال ڈال دیا تھا تو دلوں کی شادی دیکھے بغیر سعید بھی ایسا کیا بڑا ہٹ دھرمی تھا جو چلا جاتا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ کچھ دیر گانا بجانا ہو گا۔ جس کے تن بدن کے انگ انگ کی سنگیت سن کر بیماری کا حال جب یوں ہی بے حال ہو رہا تھا تو وہ اُس کا گانا کیوں نہ سنتا۔ سعید کی دقت مختلف تھی۔ لڑائی کے بعد وہ اکیلا وہاں سے نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ ویسے تو چاء کی دوکان ہی پر دونوں دوستوں کے درمیان طے ہو گیا تھا کہ جب ساری بات چیت ہو جائے تو سعید بیماری کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اور اُس تکرار کے بعد ویسے تو ہر لمحہ سعید وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا لیکن اندر ایک دل کا چور تھا جو اُسکے سارے غصہ اور نفرت

کے طوفانوں کو پیئے جاتا تھا اور اُس کے پیروں کو وہاں سے ہٹنے سے جیسے بریکار کر دیا تھا۔ سعید اُس تکرار اور شکست کے بعد بہاری کو وہاں چھوڑ کر اکیلے کھسیا یا ہوا نہیں نکلتا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اُس کے پیٹھ پیچھے دونوں کیا باتیں کریں اور بہاری اُس چڑیل کے مت میں آکر اُس کے بائے میں کیا رائے قائم کرے۔ اس کے برعکس، اگر بہاری کچھ چاہتا تھا تو صرف یہی کہ اب سعید کسی طرح وہاں سے چلا جائے۔ اور اُسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ جہاں سعید کو پہلے ہی چلانا چاہئے تھا، وہاں وہ جو تیوں کی پھٹکار سن کر بھی لٹس سے مَس نہ ہو رہا تھا۔

بہر حال طے پایا کہ کچھ دیر گانا بجانا ہو گا۔ کافی دیر موچی تھی اس لئے سازندے گھر واپس جا چکے تھے۔ لیکن اگر عودت کسی کو خوش کرنے پر آجائے تو وہ کیا کیا نہیں کر سکتی ہے۔ چنانچہ اُس پری زاد نے اپنی چلیں پہنتے ہوئے کہا: ٹھہریے، میں ابھی نیچے جاتی ہوں۔ اماں سے کہہ کر آتی ہوں۔ وہ روجن کو بلا دیں گی۔ جب سازنگی والا مل جائے گا تو بقیہ سب اکٹھا ہو جائیں گے، یہ کہتی ہوئی وہ جلدی جلدی

کمرہ کے باہر جانے لگی۔ بہاری نے سوچا موقع اچھا ہے۔  
 اسی ہانے اُس کے ساتھ اکیلے ہو کر اُس سے کچھ دل کی  
 باتیں کر لے گا۔ اس لئے یہ سوچتے ہوئے وہ بھی اٹھا۔  
 ”اندھیرے میں اکیلے آپ کیسے جائیں گی؟ رُکے میں بھی  
 آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“

لیکن اُس تکلف کا رد عمل کچھ عجیب ہوا اور ایک لمحہ کے  
 لئے اُس کے چہرہ پر پریشانی کی وہ لکیریں نظر آئیں کہ اُسے  
 دیکھ کر بہاری کا دل جیسے بیٹھ گیا۔ اور چونکہ وہ کسی بھی قیمت  
 پر اُس کی ناخوشی مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لئے جَدَن کی  
 پوتی کی بے زبان پریشانی دیکھ کر وہ مگر کسی پر سے چونکہ اٹھ  
 گیا تھا اُس لئے بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے تخت پر جا بیٹھا۔  
 سیڑھی پر اترتی ہوئی جیلوں کی آواز سے معلوم ہوا کہ سازندوں  
 کو بلانے کے لئے جوتیوں کی موسیقی کوٹھے کے نیچے تک پہنچ  
 چکی تھی۔

”یار، تم نے بھی کمال کر دیا۔ آخر بات بھی ایسی  
 کیا تھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔“  
 ”کچھ نہ کہو بھائی، سالی بڑی حرام زادی ہے۔ میں

جو جانتا کہ یہ کبخت آج پھر یہاں ملے گی تو تمہیں  
ہرگز یہاں لانے کی حماقت نہ کرتا۔“

”کیوں یہی تو روپ کنور، جدن کی پوتی ہے؟“  
”نہیں یار، تم بھی وہی ہو۔ کہاں روپ کنور اور

کہاں یہ حرام زادی۔ یہ شاید کوئی آس کی دور کی  
رشتہ دار ہے۔ کسی چھوٹے شہر سے روپ کنور کے  
یہاں اٹھنا بیٹھنا سیکھنے چلی آئی ہے۔“

”تم بھی کیا کہاں۔“

”کیا؟ یعنی وہ آپ کی نظریں بڑی باسلیقہ اور

شائستہ ہے۔ میاں ابھی ان گلیوں کی خاک کچھ دن

چھا تو تو معدوم ہو گا کہ اودھ کی طوائفیں کیا ہوتی

ہیں۔ کوئی شریف عورت ہوتی تو تم کیا سوچتے ہو

اس طرح بدزبانی کرتی۔ میاں بہاری تم کیا جانتے ہو؟

یہاں نوابوں کی اولادیں بستی ہیں۔ اپنی گردن کاٹ کر

آپ کی نظر کر دیں گی، لیکن زبان پر لفظ شکایت

نہ لائیں گی۔“

”یار بس اب شاعری نہ کرو۔ بتاؤ آخر بات

کیا تھی؟

”بات کیا تھی؟ بات، بات کچھ بھی نہ تھی۔ اُس دن یہ سوچ کر آیا کہ روپ کنور لے گی اور یہاں یہ کبخت ملی۔ معلوم ہوا کہ روپ کنور کہیں باہر گئی ہے بعد میں معلوم ہوا کہ چیف کورٹ کے سر اج الدین صاحب کے ساتھ وہ ان دنوں رہنے لگی ہے۔ کئی مہینے سے پہاڑوں پر پڑی ہے انہیں کے ساتھ۔“

بہاری حیرت کر رہا تھا اُس تقدیر پر اور سوچ رہا تھا اُس دکالت کو جو روپ کنور کے حسین اوقات کو اس طرح خریدے ہوئے تھی۔

”تمہارے کہنے کا کیا مطلب کہ روپ کنور کوئی

اور ہے اور یہ کوئی؟“

بعض جھلا کر: ”یا تم نے احمق ہی نکلے۔ جیسے عورت تم نے کبھی دیکھی نہیں۔۔ میں کوئی تم سے جھوٹ بول رہا ہوں؟“

”نہیں، میں نے سوچا شاید مذاق کرتے ہو۔ اچھا

بتاؤ ہوا کیا؟“

نسایت ہی سنجیدہ ہو کر بیماری یہ مذاق کی جگہ نہیں ہے۔  
 جو تمھاری طرح یہاں ہنسی اور مذاق کے خیال سے  
 لگتے ہیں وہ کہیں کے نہیں رہتے۔ اس تاریک دنیا  
 کی یہی خصوصیت ہے کہ اپنے شکار کو پہچان کر یہ  
 اُس پر اسی تیزی اور صفائی سے چھا پہ مارتی ہے  
 جیسے شیر مچان کے پاس بندھے ہوئے بکرے پر۔  
 ”سعید، تم معلوم نہیں کیوں خواہ مخواہ آج عجیب  
 ذہنی کیفیت بنائے ہوئے ہو جس کی وجہ سے اس  
 وقت سب تمھارے دشمن ہیں اور ہر چیز خطرہ کی  
 شکل اختیار کر کے تمھارے سامنے آرہی ہے۔  
 میں تم سے اُس رات کا واقعہ جانتا چاہتا ہوں  
 اور تم۔“

”اور تم معلوم نہیں کیوں اُس روز کا واقعہ جاننے  
 کے لئے سمرے جا رہے ہو۔ اُس روز کا واقعہ  
 دراصل اگر سوچو تو کچھ بھی نہ تھا۔ میں یہاں اس خیال  
 سے آیا کہ روپ سے ملاقات ہوگی۔ تم سے میں نے  
 بتایا کہ اُس کی میری تھوڑی ملاقات تھی۔ اگر اور

کچھ نہیں تو کم سے کم اتنی سلیقہ کی عورت ہے کہ اُس کے پاس دس منٹ بیٹھ کر ہی طبیعت بدل جاتی ہے۔ لیکن میں نے بتایا کہ وہ باہر گئی تھی۔ مگر اب جو آگیا تھا تو فوراً چلا بھی کیسے جاتا۔ پھر یہ بھی میں نے سوچا کہ شاید یہ بھی اُسی ذات کی پُود ہے۔ اس لئے آگیا تو اسی سے کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کروں۔ لیکن وہ باتیں کیا کرتی اس کو تو جب دیکھو تب اپنا پیشہ “

بھاری بیٹھا باتیں سُن رہا تھا اور اندر سی اندر یہ سوچ کر سُسکا رہا تھا کہ سعید بیجاری سے اتنا بدظن ہو گیا ہے کہ اُس کے ساتھ کسی حالت میں بھی انصاف کرنے کو تیار نہیں ہے ورنہ جہاں تک اُس نے دیکھا تھا جب سے وہ آیا تب سے اُس نے کم سے کم اُس سے تو کوئی روزگار کی بات نہیں کی۔ لیکن سعید ایسے جذباتی کیفیت میں تھا کہ طوائف کے کمرہ میں اپنے کو اس طرح اکیلا پا کر وہ طوائفوں کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا جیسے سب کہہ ڈالنا چاہتا تھا۔

”خیر میں نے سوچا یہی سہی شکل صورت تو کبھی

کی کوئی ایسی بڑی تھی نہیں۔“  
 ہماری اپنی تشخیص سعید کے بارے میں اس حد تک  
 صحیح اُترتے دیکھ کر آدی کی کزدریوں کا اچھا خاصہ ماہر بنا  
 ہوا دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اُس پری زادی کا بکر  
 اُن الفاظ میں سن کر آخر وہ اور کیا سوچتا۔

”بات دس روپیہ پر طے پائی مجھے شبہ ضرور ہوا۔  
 مگر اُس وقت کیسے کچھ کہتا۔ لیکن جب کمرہ کھلا اور  
 روشنی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ کوئی اور تھی۔  
 خیر میں اپنا غصہ پی کر رہ گیا۔ اور اِس کی بدھنگا  
 دیکھنے کہ اُس کے بعد میرے سامنے آئی بھی نہیں۔“  
 ہماری کمرہ کے باہر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس خیال  
 سے کہ وہ اب تک آئی نہیں، بس یوں ہی جیسے بات جاری  
 رکھنے کے لئے شبہ میں بولا۔ ”یہ تو عجیب بات بتا رہے  
 ہو۔ شاید۔“

”شاید واید کچھ نہیں۔ تم اصل میں انہیں ابھی  
 جانتے نہیں۔ جب جان جاؤ گے تو میری باتوں کی  
 قیمت سمجھو گے۔ مجھے ان حرام زادیوں کا بڑا تجربہ ہے۔“

انہیں خوب پہچانتا ہوں میں۔ لیکن یہ تو ان کی خوش  
 قسمتی ہے کہ عام طور سے ان کا سابقہ تمکھا رہے  
 جیسے لوگوں سے پڑتا ہے۔ اور پھر یہ اس خوشی اور  
 اطمینان سے اپنے چاہنے والوں کو لوتی اور ننگا کرتی  
 ہیں کہ پھر وہ کہیں کے نہیں رہتے۔ ایسے ہی ایک بار  
 اور اتفاق ہوا۔ میں بیس یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔  
 معلوم ہوا کوئی بڑی حسینہ آئی ہیں۔ کالج کے ناٹج بہ کار  
 لڑکوں کا جلمٹ لگا رہتا تھا۔ لیکن روزیہ سنوں  
 کہ آج کسی کی سونے کی گھڑی ظالم نے رکھوایا ہے  
 تو کوئی صاحب اپنی انگوٹھی دے آئے۔ فیس بھی  
 صاحبزادی بہت اونچی رکھے ہوئے تھیں۔ لیکن فیس  
 سے بھی زیادہ، اپنے عشق کے جادو کا جال بچا رہے  
 لڑکوں پر ڈال کر ان کی جیبیں خالی کر لیتی تھی۔ ایک  
 بچا رہے تو ایسا اس کے چہرے کے میں آیا کہ کتابیں اور  
 کپڑے وغیرہ سب بیچ کر انہیں دے آیا۔

بھاری نے کمرہ کے چاروں طرف کسی قدر شبہ کی نگاہ  
 سے دیکھا اور اس تشویشناک خیال سے ذرا پریشان ہو کر کہ وہ

ابھی تک نہ آئی، تخت پر سے اٹھا اور سعید کے بغل میں آکر بیٹھ گیا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر کیا ہوا؟ یہی ہوا کہ یاروں سے ملے ہوا کہ میں بھی ایک دن اُس جادوگر نی کے درشن کروں۔“  
سعید کے منہ سے لفظ جادوگر نی، سن کر باری اندر ہی اندر ذرا سہمسا۔ لیکن اُس نے پھر اپنے کے سنبھالا۔ سعید کو جیسے جنون تھا۔ بغیر کچھ سوچے ہوئے دماغ کا بوجھ ہلکا کئے ڈال رہا تھا۔

”میں اُن کا سب سے بڑا بھگت بنا۔ ایسا کہ اُنھوں نے سودا بھی معمولی ڈھنگ ہی سے ملے کیا۔ شاید خیال ہوا ہو کہ ایسے سے سودا کرنے سے کیا فائدہ جو خود ہی اپنے کو بنا بھاؤ کے نیچے ڈال رہا ہے۔ وہ تو صبح نیند کھلنے پر معلوم ہوا تا کہ تکیہ کے نیچے تہ وہ پچاس روپیہ تھے اور نہ سونے کے گنے۔“

”تو کیا تم صبح سے پہلے اپنے روپے اور اُس کے گنے سب لے بھاگے؟“

”لے بھاگے؟ بیگم کو نیند آئی نہ تھی کہ تکیہ کے نیچے

ہاتھ ڈال کر جو گئے انہوں نے سونے سے پہلے اتار  
کر رکھ دیئے تھے نکالا اور سب مال طال رو مال میں  
اطمینان اور احتیاط سے میں نے باندھا اور پھر ایک

دو تین کب کا چمپت ہوا۔

بابو بہاری لال اور گھبرائے۔ ”تو یہاں یہ سب بھی

ہوتا ہے؟“

”یہ سب؟ ارے یار یہاں یہی ہوتا ہے۔ ویسے

یہاں کیا نہیں ہوتا۔۔۔ میاں ڈاکہ پڑتا ہے، خون

ہوتا ہے، قتل ہوتا ہے۔ کیا نہیں ہوتا۔ یہ دنیا کوئی

شریفیوں کی دنیا تھوڑے ہی ہے۔ لوٹنے اور گلا

کاٹنے کے لئے ہی یہاں یہ تخت پر فرش لگائے

بیٹھی رہتی ہیں۔ پان دان ان کی تجارت کا سب

سے بڑا ہتھیار ہے۔ دو بیڑے پان کے احسان

سے کس کے گلے میں پھندا یہ نہیں ڈال دیتی ہیں۔

دراصل پان میں کیا کیا ملتا رہتا ہے یہ تو کم ہی

پان کھانے والے جانتے ہیں۔“

بہاری نے بھی وہی پان کھایا تھا۔ دانتوں میں کچھ چھایا

پھنسی رہ گئی تھیں اگلا دن میں تھوکنے لگا۔ بھائی اب چلو۔  
 اور زیادہ باتیں مت سناؤ۔ میرا جی گھبرارہا ہے۔  
 ایک بار سعید بھی سُکرایا۔ ابھی کیسے چلو گے؟ پھنسنے ہو تو  
 اتنے سستے کیوں چھوٹو گے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ اب تک  
 سا زندے ہی بلا رہی ہے؟ کوئی تعجب نہیں اگر وہ بغل کے کمرہ  
 میں کسی اور کے ساتھ ہو اور پھر اگر یہاں اتنی دیر بیٹھنے کی  
 فیس بھی ہم لوگوں سے وصول کر سکتی ہے۔“

”نہیں بھائی اگر یہ سب نہ بھی ہو تب بھی یہاں سے  
 اب چل دینا چاہئے۔ آخر ہم لوگ کب تک اس طرح  
 یہاں بیٹھے رہیں گے۔“

بھاری اٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی  
 تھی۔ کمرہ کی ہر چیز جیسے اُس کو ڈرانے لگی تھی۔

”بیٹھو، آخر گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں تو جانتا

ہوں جہاں وہ گئی ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھو وہ آتی ہوگی  
 نیچے جاتے وقت ہونہ ہو اُسے کوئی زینہ پر مل گیا۔

پیسہ ہاتھ سے جانے دینے والی عورت نہیں ہے وہ۔“

بھاری ایک ٹک تخت پر سے نیچے ٹپکتی ہوئی سفید چادر کے

کنارے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔  
 سعید نے پوچھا۔ ”کیا دیکھ کیا رہے ہو؟“  
 بہاری چادر کے حاشیہ اور کونوں پر کڑھائی کا کام دیکھتے  
 ہوئے بولا۔ ”یاراتنہ عمدہ پھول کاڑھے ہیں اس ظالم نے۔“  
 ”اچھا تو تم ابھی یہاں کے پھولوں ہی کو دیکھ رہے  
 ہو۔ یہاں کے کانٹے اور بھی دیکھنے کے لائق ہوتے  
 ہیں۔ ہاں دیکھ لو غور سے۔ بی بی سے کتنا ایسے ہی  
 پھول تمھاری چادروں میں وہ بنا دیں گی۔“  
 بہاری زمین پر بیٹھا چادر اُلٹ کر اُس کے کونے کی نقاشی  
 دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ایک دم چونکا۔ سعید بھی چونکا ہوا۔  
 اب جو دونوں کی نظرس تخت کے نیچے گئیں تو آدمی کا دھڑو  
 حصوں میں نظر آیا۔ بہاری جو پیچھے ہٹنا چاہا تو پھاڑ کھڑا  
 فرش پر گرا۔ سعید نے آگے بڑھ کر نیچے لٹکتی ہوئی چادر ایک دم  
 اوپر کو اُلٹ دی۔ اوپری دھڑ کی پھرائی ہوئی آنکھیں سعید کو دیکھ  
 رہی تھیں۔ ملامتوں سے لٹ پھرت ہو رہی تھی۔ سعید نے  
 گھوم کر آنکھیں پھاڑ کر جو بہاری کو دیکھا تو اُس کا چہرہ چادر کی  
 طرح سفید نظر آیا۔ جس وقت وہ بہاری کا ہاتھ پکڑ کر اُسے

ایک کنارے کر رہا تھا اُس نے دیکھا کہ وہ چلانے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن آواز گلے سے نکل نہیں پا رہی ہے۔ اُس نے بہاری کے منہ پر اپنی ہتھیلی رکھتے ہوئے اُس سے اشارہ کیا اپنے پیچھے پیچھے چلنے کو باہر جاتے جاتے سعید نے تخت پر مڑی ہوئی چادر نیچے گرا دی۔ برآمدہ میں جا کر اُس نے اٹکلی سے اشارہ کر کے بہاری کو وہیں کھڑے رہنے کی تاکید کی اور خود سیرھی کی طرف بڑھا۔ لیکن وہاں اُس طرح اکیلے کھڑے رہنا بہاری کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے آہستہ آہستہ وہ بھی سعید کے پیچھے پیچھے چلا۔ سعید کو اس کا پیچھا کرنا اچھا نہ لگا۔ لیکن بہاری کو بھانے یا ڈھارس بندھانے کا وقت کہاں تھا۔ بہاری بھی زیادہ سوچ سمجھ کیا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سوال اُس وقت صرف جینے کا تھا اس لئے اُس کے اندر سے جیسے کسی نے آواز دی۔ ”سعید تمہیں چھوڑ کر چلا نہ جائے۔“

سعید نے نیچے جا کر جو تھوٹے دروازہ کو دھکا دیا تو معلوم ہوا کہ باہر سے دروازہ بند تھا۔ دباغ چونکہ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا اس لئے باتیں دھیرے دھیرے سمجھ میں آرہی تھیں۔ چنانچہ جب وہ بہاری کا ہاتھ پکڑے اوپر آیا تو پوری صورت

اُس کی سمجھ میں آئی۔ اپنے ہونٹھوں پر اُنکلی رکھ کر اُس نے آہستہ سے بہاری سے کہا۔ ”جان کا سوال ہے۔ میرے پیچھے آؤ۔ جو کرتا ہوں وہ کرو۔“ بہاری اُس کے پیچھے پیچھے چلا۔ لیکن جب سعید پھر اُسی کمرہ میں داخل ہونے لگا، جس میں آدمی کے دو ٹکڑے رکھے ہوئے تھے، تو اُس کے قدم آگے نہ بڑھیں لیکن فوراً اُس کو سعید کا جملہ یاد آیا۔ ”جان کا سوال ہے“ چنانچہ وہ سعید کے ساتھ ساتھ کمرہ پار کر گیا۔ جس وقت وہ غسل خانہ میں ہو کر گزر رہا تھا اُس کے سر سے کوئی چیز چھو گئی۔ اُس نے جو چونک کر دیکھا تو کھونٹی پر کسی عورت کے سر کے نقلی بال لٹک رہے تھے۔ وہ جھپٹ کر بہاری کی بغل میں ہو گیا۔ سعید پیچھے کوٹھے کے بلیسر کے پاس پہنچ کر دوسرے کوٹھے پر چھلانگ مارنے کے لئے گلی کے فاصلہ کا اندازہ کر رہا تھا۔ بہاری نے جو نیچے جھانک کر دیکھا تو اُس کا دل بیٹھ گیا۔ سعید بلیسر پر چڑھ کر بہاری کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ جب اُس نے دیکھا کہ بہاری بالکل بے دم ہو رہا ہے تو اُس نے اپنا جملہ پھر دوہرایا۔ ”بہاری، جان کا سوال ہے“ اور جب تک بہاری بلیسر کے اوپر چڑھتا سعید گلی پھانڈ کر

دوسرے کوٹھے پر پہنچ چکا تھا۔ دوسرے کوٹھے کی چھت پر پہنچنا بہاری کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن سعید کے اُس طرف نکل جانے کے بعد جو اُس نے اپنے کو وہاں اکیلا محسوس کیا تو وہ بھی جان پر کھیل گیا۔ سعید اب دھیرے دھیرے دوسرے مکان کی چھت کا جائزہ لے رہا تھا۔ دیوار پر سے گندے پانی کا جو پائپ نیچے جا رہا تھا اُسے دیکھ کر اُس نے سوچا کہ اُس کے سہارے نیچے اتر جائے۔ لیکن اُسی وقت گلی میں حرکت ہوئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پگڑی باندھے کھڑا ہے چنانچہ وہ بہاری کا ہاتھ پکڑے مکان کی تیسری منزل پر چڑھ گیا۔ اوپر پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ اُس مکان سے بغل والا مکان بالکل ملا ہوا ہے۔ رفت صرف یہ تھی کہ دیوار پر شیشے کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ اُس نے جیب سے رومال نکالا اور اسے ہاتھ میں لپیٹ کر بغل والے مکان کی چھت کی تیر لوہے کی سلاخ ہاتھ سے پکڑ لی اور پھیشوں کے ٹکڑوں پر جوتے رکھ کر تیسرے مکان کی چھت پر پہنچا۔ اُس مکان کی چھت پر پہنچ کر اُس نے آہستہ سے بہاری کے کان میں کہا۔

”اب ہمت سے کام لو۔ بہاری نے سوچا موت یہیں کہیں

ہے۔ سعید آہستہ آہستہ زمینہ سے دوسری چھت پر آیا۔  
 کوئی ٹین کی چھت کے نیچے سو رہا تھا۔ سعید سونے والے کے  
 بالکل بغل سے نکلا۔ بائیں طرف ایک اور زمینہ نظر آیا۔  
 اُس سے نیچے اُتر گیا۔ سیرٹھی جہاں ختم ہوتی تھی وہاں  
 دروازہ بند تھا۔ دروازہ کو ٹھول کر سعید نے معلوم کیا کہ  
 تالا نہیں بلکہ چٹختی ہے۔ لیکن جو چٹختی کھولی تو آگے گلی نلی۔  
 ایک منٹ کے لئے ٹکھرا رہا۔ پھر انداز لے کر باہر نکل پڑا۔  
 جس وقت دونوں گلی میں تیز قدم چل رہے تھے بہاری  
 نے ذرا آگے جا کر بھاگنا چاہا۔ سعید نے اُس کا کندھا پکڑ  
 کر پیچھے کھینچ لیا۔ بہاری سعید کو گوستا ہوا جتنا تیز قدم سعید  
 اُس کو چلنے دیتا تھا چلتا رہا۔ اور لگاتار یہی سوچتا رہا کہ  
 اس کی سخت نے کہاں لاکر بھنسا یا۔ لیکن اُس وقت تو جان  
 کا سوال تھا۔ اس لئے اُس کے پانے کا افسوس نہ رہا  
 جس کی تلاش میں آج سیر شام ہی چوک کی تنگ سڑک  
 پر وہ آ نکلا تھا۔



# میرا پہلا براڈکاسٹ

بہت دن نہیں ہوئے، ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ نیویوسٹی  
میں کچھ دنوں ملازمت کر کے اُن دنوں قریب قریب بیکار ہی  
تھا۔ کسی اور حالت میں وہ نہایت ہی مایوس کن بات ہوتی۔  
لیکن صرف اُس سن اور اُس کی بخشی ہوئی ذہنی صحت ہی کا  
تقاضا تھا جو میں نے ہمت اور اُمید کی لگام ہاتھ سے بالکل نہیں  
چھوڑ دی۔ بجائے کسی جان مار مایوسی اور بے صبری کے، طبیعت  
کی وہ کیفیت تھی کہ موافق یا غیر موافق ہوا کے چلنے سے تنکے کی  
ہر حرکت کو اپنے لئے کسی نہ کسی خوشی کا پیا مبر سمجھتا تھا۔  
بہر حال ایک دن ایسے ہی بیٹھے بٹھائے دیکھتا کیا ہوں  
کہ ڈاکٹرنے نے ایک لمبا لفافہ لا کر میرے لیٹر بکس، میں ڈال دیا۔  
لفافہ جب نکالا تو دیکھا کہ اُس پر ڈان ہنز میجسٹریٹس سروس، لکھا

ہوا ہے۔ اس سے پہلے چونکہ اس قسم کا لفاظی پانے کا کم ہی اتفاق ہوا تھا اس لئے خط کو دیکھتے ہی جیسے آنکھوں میں اُمید کے آنسو بھر آئے۔ لفاظی ہاتھ میں لیتے ہی ایک دوسری عبارت پر نظر پڑی۔ آل انڈیا ریڈیو پھر کیا تھا دل بلیوں اُچھلا۔ آپ شاید اسے دماغ کا فتور کہیں۔ لیکن اُس وقت جب بھی میں ملازمت کی سوچتا تھا تو یونیورسٹی کے علاوہ، دوہی اور معقول جگہوں کا خیال آتا تھا، یعنی دلی سرکار کی نوکری یا آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت۔ ایسی حالت میں لفاظی پر آل انڈیا ریڈیو لکھا دیکھ کر دل پر کیا گزری ہوگی، آپ خود ہی سوچئے۔

ریڈیو کے اُس لفاظی کو میں نے نوکری کا خط سمجھا۔ میری خوشی اور پریشانی کا اندازہ آپ لگائیے۔ لیکن تجربہ کی بنا پر اب یہ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا یا اپنی قسمت سے اس قسم کی اُمیدیں رکھنا اور بالو پر دیوار بنانا ایک ہی ہوا۔ لفاظی پھاڑتے پھاڑتے جیسے دل پھٹ گیا۔ خط کے مضمون سے معلوم ہوا کہ ۸ فروری کو لکھنؤ ریڈیو سے تقریر ”براڈ کاسٹ“ کرنا ہے۔ لے دے کے ۳۵ روپیہ۔ جی ہاں کل ۳۵ روپیہ، کیونکہ اُس وقت ایک تقریر کے لئے ریڈیو سے ۳۵ روپیہ کا صرف ایک چک یعنی

روپیہ تئیں بلکہ روپیہ ملنے کا کاغذی وعدہ ملتا تھا۔ اسے لڑائی کی منگوائی یا میری خوش قسمتی کیسے جو آج ۵۰ روپیہ کے عیوض اپنی ۳۵ روپیہ کی ریڈیائی کامیابی کی کمائی آپ کو سنا رہا ہوں۔

لیکن جب سنبھل کر سوچا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ برا کیا ہے۔ اپنے کو سمجھایا۔ بھئی روپیوں کی مت سوچو۔ کچھ معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں نقد کی بات کم اور عزت اور مرتبہ وغیرہ کی صورتیں زیادہ سوچی جاتی ہیں۔ ویسے ریڈیو پر بولنے کا صلہ بھی بہت پُرانا تھا۔ لیکن اور حوصلوں کے ساتھ وہ بھی اس مایوس کن زندگی میں پورا ہوتا دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام بنانے والے ایک صاحب ایک بار اس طرف آئے بھی۔ لیکن یونیورسٹی کے اور لوگوں کے ساتھ میری بھی "قیمتی" رائے لے کر چلے گئے۔ روپیہ سواروپیہ آن کی خاطر تواضع میں صرف ہو گئے۔ ہاتھ کچھ نہ لگا۔ اس لئے سوچا، موقع اچھا ہے۔ اسی ہانے سرکاری خرچے پر لکھنؤ بھی ہو آئیں گے۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ وہاں بھی بڑے بڑے دفتر کھل رہے ہیں۔ اقتصادیات والوں کی ان دنوں ہر جگہ

کھپت کی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ کون جانے کہاں اور کب کام بن جائے۔ ایک ہی ڈھیلے میں دو بیر۔ اور اگر کچھ نہ ہو تو یہ کیا کم کہ آواز فضا میں کیلاش پر بت سے لے کر اس کماری تک لہرائے گی۔ الفاظ ستاروں کے منہ چومیں گے سچلے کمکشال سے ہو کر گزر جائیں گے۔

اس طرح اپنی آنکھوں کا بوجھ لے اٹھا۔ خط اٹھا کر پھر سے دیکھا۔ دیوار پر ٹکے ہوئے کیلنڈر سے براڈ کاسٹ کی تاریخ ملائی۔ پھر سرخ موٹی پنسل لے کر کیلنڈر پر ۸ تاریخ کو ایک سرخ گولائی میں گھیر دیا۔ خط لے ہوئے اندر گیا۔ میاں کی باچھیں کھلی دیکھ کر بوی بھی مسکرائیں۔ سمجھیں ہونہ ہو کوئی خوشخبری ہے۔ لیکن اس ڈر سے کہ وہ کچھ زیادہ نہ سمجھ لیں میں نے فوراً بتا دیا۔ ”ریڈیو پر بولنے جانا ہے۔“ بچے ایک دم چلا اٹھے۔ ”بابور ریڈیو پر بولیں گے، بابور ریڈیو پر بولیں گے۔“ آنت بیج گئی۔ بی بی کو دیکھا، بیچاری کچھ پریشان سی ہیں۔ اس ہنگامہ میں پوری بات ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ شاید اس خیال سے پریشان تھیں کہ ریڈیو پر تو گانا بجانا ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے انھیں سمجھایا۔ ”اس دن

ہٹلر کو بولتے سنا تھا نا، ہاں، بس وہی“

یہ مرحلہ طے ہوا تو اب دوسرے مرحلے پیدا ہوئے۔ سوچنے لگا کہ اس احسان ناگمانی کے لئے کون ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ نیکی کرنا اور اس طرح چھپ چھپ کے۔ دل جیسے بھر آیا۔ بے تیشا کرشن چندر صاحب کا خیال آیا۔ چونکہ اردو کے بہت بڑے اریب مانے جاتے تھے اس لئے ایک آدھ قصہ کہانی لکھنے کے تاتے ایک بار ان سے بھی خط کتابت کر بیٹھا تھا۔ وہ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ہی ملازم تھے۔ میں نے سوچا، ہونہ ہو میرا آرٹ، اُنھیں بھی پسند آیا۔ اس لئے شاید میری عزت افزائی کی اُنھوں نے یہ صورت نکالی ہے۔ احسان مندی کے جذبات کے اظہار سے عرض سے فوراً ایک خط اُنھیں اُسی وقت ٹائپ کر کے ڈال دیا اور خط کے آخر میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ جب لکھنؤ آؤں گا تو آپ ہی کے وہاں قیام کروں گا۔

خط کے جواب کے انتظار کی کہاں فرصت تھی۔ سوچا، خط پہنچ ہی گیا ہوگا، جواب آئے نہ آئے۔ اصل میں اُس دماغی جلد بازی میں اس قسم کے نازک اور ”رقتی“ پہلوؤں کی طرف خیال بھی کیسے جاتا۔ یہ تو براڈ کاسٹ کا بھوت سر سے اترنے

کے بعد ہی معلوم ہوا کہ بیچارے مصروفِ کوشش چندر کو اس براڈ کاسٹ کے دعوت نامہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یعنی وہ ایک دوسرے ہی صاحب کی مہربانی تھی۔ ایسی حالت میں کوشش چندر صاحب میرا خط پا کر شرمندہ نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ اور پھر خط میں دھمکی جو تھی، یعنی لکھنؤ پہنچ کر انھیں کے وہاں ٹھہرنے کا اصرار تھا۔ ایسی حالت میں خط کا جواب کون دیتا اور اپنے سر بے مانگی مصیبت مول لیتا۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، میرے اوپر تو اور ہی سرگرمیاں حاوی تھیں یعنی کس گاڑی سے جاؤں، کس درجہ میں سفر کروں، کیا کیا کپڑے ساتھ لے جاؤں، لکھنؤ میں کتنے دن ٹھہروں، وغیرہ وغیرہ۔ بات کل ۳۵ روپے کی تھی۔ اس لئے یہ خیال مستقل دماغ پر چھایا رہا کہ ٹوٹے وقت ضرور کچھ بیچ کر آنا چاہئے کیونکہ ایک طرح سے وہ میری پہلی ”ادبی کمائی“ تھی خیر صاحب ایک ایک کر کے سب منزلیں طے ہوئیں اور میں سی طرح جان لے کر رات کے ساڑھے نو بجے انٹر کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔

ویسے تو گھر سے روانہ ہونے سے پہلے مسودہ لکھ چکنے سے

بعد اُسے کئی بار دوہرا ڈالانا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہ مسودہ کا اچھا  
 خاصا حصہ اب حفظ ہو چلا تھا۔ کبھی گھڑی سامنے رکھ کر کبھی  
 کسی دوست کو بٹھا کر، غرض کہ ہر حالت میں اور ہر صورت سے  
 مسودہ کا مطالعہ کر کے اُسے پندرہ منٹ کے وقت کی پابندی  
 کے لحاظ سے پکا کر لیا تھا۔ اگر آپ پوچھیں کہ آخر وہ کون سا ایسا  
 اہم مسئلہ تھا جس پر اس بڑی طرح عقل اور غور و فکر کا صرف  
 ہوا اور اتنی خواہ مخواہ کی پریشانی اٹھانی پڑی، تو صاحب اب  
 مضمون کا عنوان تو یاد نہیں رہا۔ لیکن اتنا ضرور یاد پڑتا ہے  
 کہ کسی سلسلہ میں لڑائی کے بعد پیدا ہونے والی دنیا کی جیسے  
 ایک مجسمہ تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی میں نے۔ خیر چھوڑیے ان  
 باتوں کو۔ اصل میں ریڈیو کے واسطے مضمون لکھنا بقیہ دیگر  
 لوازمات اور جھنجھٹوں کے مقابلہ میں سب سے آسان کام ہوتا  
 ہے۔ حقیقتاً اس سلسلہ میں جو دوسب سے بڑی مشکلیں پیش  
 آتی ہیں ان میں سے ایک ہے لکھنؤ تک سفر کرنا اور دوسری  
 ہے ٹھیک پندرہ منٹ میں بغیر کھانے ہوئے پوری تقریر  
 پڑھ کر سنا دینا۔ پہلی دقت کا ذکر کر چکا ہوں۔ دوسری پریشانی  
 کا دورہ ٹرین کے سفر ہی میں شروع ہو گیا۔

تقریر کی ایک نقل پہلے ہی بذریعہ ڈاک لکھنؤ بھیج چکا تھا۔  
 احتیاطاً دوسری نقل جیب میں رکھ لی تھی۔ چنانچہ ٹرین میں جب  
 تک نیند نہیں آگئی تب تک اُسے بار بار پڑھنا رہا۔ پھر بھی دماغ  
 میں مسلسل یہ خلش رہی کہ کس طرح ٹھیک پندرہ منٹ ہی پر یعنی  
 نہ ایک سیکنڈ پہلے نہ ایک سیکنڈ بعد، تقریر ختم ہو جائے گی۔ ساتھ  
 ساتھ جو دوسرا احساس مارے ڈالتا تھا وہ یہ تھا کہ معلوم نہیں  
 ملک کے کونے کونے میں کون کون ہستیاں میری تقریر سنتی  
 ہوں اور پتہ نہیں کیا رائے قائم کریں۔ کبھی گاندھی جی کا اور  
 دلش کے دوسرے نیتاؤں کا خیال آئے تو کبھی لاٹ صاحب  
 وغیرہ کا خیال ستائے۔ دوستوں دشمنوں کو بھی سوچا۔ غرضکہ دماغی  
 کیفیت ایسی تھی کہ بس سارے ملک کو اپنا براڈ کاسٹ ہی سنتا  
 محسوس کرتا رہا اور اُس خیال سے اسی طرح پریشان ہوتا رہا۔  
 لیکن اس ڈرامہ کا قیامت خیز منظر اُس وقت شروع ہوا  
 جب میں لکھنؤ اسٹیشن سے تانگے پر سوار ہو کر ریڈیو ہاؤس کی  
 طرف روانہ ہوا۔ ویسے لکھنؤ اُس سے پہلے بھی آنے کا اتفاق ہوا  
 تھا۔ لیکن آج لکھنؤ میں داخل ہوتے وقت عجیب تجربہ ہوا۔ ایسا  
 معلوم ہونے لگا کہ جیسے سڑکوں پر چلنے والے مجھے دیکھتے ہی پہچان

جاتے ہیں اور ان کی پُرمعنی نگاہیں کھتی ہیں۔ آپ ہی ریڈیو پر آج تقریر کریں گے! جوں جوں تانگہ شہر کے اندر چلتا گیا یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک اسٹیج ایسا بھی آیا جب میں نے محسوس کیا جیسے سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے بھی مجھے پُرمعنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کی بنی ہوئی مخصوص صراحیوں نے بھی جو ایک ٹھیلے پر لدی جا رہی تھیں، منہ کھول کر میرا استقبال کیا۔ مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ میری باتوں پر شاید یقین نہ لاکر ہنسیں۔ لیکن یہ باتیں دراصل اس طرح ہنسنے سے نہیں بلکہ ریڈیو پر پہلی بار براڈ کاسٹ کرنے سے تعلق رکھتی ہیں!

تانگہ ریڈیو ہاؤس کے سامنے ہی پہنچ کر رکا۔ کمرشن چندر صاحب کی خط کا جواب نہ دینے کی ترکیب رد ہو گئی۔ اندر میرا پیغام پا کر انھیں باہر نکل کر میرا استقبال کرنا پڑا پھر وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ وہاں ضروریات سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں ریڈیو ہاؤس واپس آیا۔ خود بھی جی چاہا، کمرشن چندر صاحب نے بھی براڈ کاسٹ کرنے کے کمروں کو اندر سے دیکھانے کی خواہش ظاہر کی۔ جو دو چیزیں کثرت سے نظر آئیں وہ تھیں

دنگ بزننگ کی عورتیں اور قسم قسم کے تار۔ میں سوچنے لگا، اپنی نا بکھی میں میں ریڈیو کو بے تار کا تار سمجھے بیٹھا تھا۔ لیکن یہاں سے زیادہ تار شاید ہی کہیں اور نظر آئے تھے۔ عورتوں کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ریڈیو وہ دنیا ہے جہاں مردوں سے زیادہ عورتیں ہوتی ہیں۔

ایک کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ کچھ پڑھے لکھے لوگ جھوم جھوم کر اور آگے قدم بڑھا بڑھا کر ٹانگ، کے اندر کچھ کہہ رہے تھے، جیسے دیہاتی عورتیں لڑنے وقت ایک دوسرے کو جھپٹ جھپٹ کر لگایاں دیتی ہیں۔ کمرہ میں طرح طرح کی چیزیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دو آدمی مٹی کے بڑے ناند اور کوندے "تھپ تھپ تھپ تھپ" پیٹ رہے تھے۔ میرے دوست نے مجھ سے بتایا، دیہاتی پر دگرام، براڈ کاسٹ، ہو رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "لیکن یہ لوگ تو پڑھے لکھے لگتے ہیں؟ پھر ان سے معلوم ہوا کہ دیہاتی زبان میں اس کام کو بھی شہری لوگ ہی انجام دیتے ہیں۔ بہر حال کمرہ کے اندر جس قسم کی چیزیں پھیلی ہوئی تھیں ان کی وجہ سے پورا کمرہ جیسے ہندوستان کا نقشہ لگ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، کاش اس کمرہ کے دروازہ پر "ہمارا ہندوستان" لکھا ہوتا۔ ایک دوسرے

کمرہ میں اچھی بھلی عورتیں رد و صحر کر کھرام بچائے ہوئے تھیں۔  
 معلوم ہوا ذیباتی عورتوں کے لئے براڈ کاسٹ ہونے کے واسطے  
 ڈرامے کا 'ریپرسل' ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا، انسانی زندگی  
 کی دکھ درد کی کہانی کا کیا ہی مذاق بنتا ہے یہاں پر۔

اسی طرح اور چیزیں دکھیں۔ اتنے میں ایک صاحب  
 بہت سے کاغذات وغیرہ لئے ہوئے آگے اور کچھ بات چیت  
 اور سوال جواب کے بعد یہ طے پایا کہ میری تقریر کا بھی 'ریپرسل'  
 ہو جانا چاہئے۔ اور اب ہمیں سے میری معیبتوں کی گھڑی  
 شروع ہوتی ہے۔ ہم لوگ پھر اس مخصوص کمرہ میں داخل ہوئے  
 جس میں سے صرف تقریریں براڈ کاسٹ ہوتی ہیں۔ کمرہ نہایت  
 ہی سجا ہوا تھا۔ ایک طرف صوبہ کے گورنر صاحب ایک تصویر  
 میں سامنے 'ٹائیک' رکھے تقریر کر رہے تھے۔ دوسری طرف صوبہ  
 کے وزیر اعظم صاحب یہی کام انجام دے رہے تھے۔ اسی طرح  
 اور بھی کئی بڑی بڑی ہستیاں تصویروں میں دیواروں پر لٹکی  
 ہوئی نظر آئیں۔ اب تو میری رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی۔ جس  
 میز پر بیٹھ کر تقریر کرنی تھی وہ پچاسی کا تختہ لگنے لگی۔ مجھے  
 پچاسی کا تو ذلتی تجربہ نہ تھا۔ لیکن ایسا محسوس کرنے لگا جیسے

پھانسی کی بس تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سامنے دیوار پر جو گھڑی لگی تھی اُس میں صرف کچھ گھڑی پڑی لیکر میں نظر آئیں۔ یہ اور غضب! بیچ میں اگر وقت دیکھنا چاہئے تو وہ بھی ناممکن۔ معلوم ہوا اس قسم کی گھڑیاں خاص طور سے ریڈیو ہی کے واسطے بنتی ہیں، جو صرف منٹ بتاتی ہیں۔ سامنے جو ماٹک، رکھا تھا وہ بھی کچھ عجیب و غریب قسم کا تھا، یعنی اچھا خاصا شہد کی مکھیوں کا چھتالگ رہا تھا۔

مگر ہند ہو جانے کے بعد وہ دم گھونٹنے والا سکوت قائم ہوا کہ بس ایسا محسوس کرنے لگا جیسے بغیر پانی کے گہرے کنوئیں میں پڑا ہوں۔ کھانسی بڑی طرح ستانے لگی۔ گلا سوکھ سوکھ کر چھنسا جاتا تھا۔ ریسرل کے بعد معلوم ہوا، تقریر ایک منٹ چھوٹی ہے۔ چاہا جلدی جلدی دو چار جملے اور گھسیٹ لوں۔ لیکن اسے ماحول میں قلم بھی ظالم کیا چلتا۔ چلتا کم، کاغذ میں گھستاز زیادہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے موت کی وہ گھڑی بھی آگئی۔ جو صاحب براڈکاسٹ کرنے والے تھے انھوں نے جھٹ ایک آلہ اٹھا کر اپنے دونوں کانوں پر الجھالیا اور پھر میرے مسودہ کے صفحوں کو کاغذ کی مختلف دقتیوں پر کیلیں مارنے لگے۔ میں نے پوچھا آخر یہ اہتمام

کیوں؟ انھوں نے بتایا کہ اگر صفحے اُلٹتے پلٹتے وقت ہل گئے تو  
دور سننے والوں کو ایسا معلوم ہوگا جیسے ریڈیو ہاؤس میں پہاڑ  
اُلٹ پڑا۔ میں نے کہا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو ضرور انھیں اچھی  
طرح جڑ دیجئے۔ گھر پر بی بی بچے سنتے ہوں گے.....“ جملہ پورا  
نہ ہو پایا کہ ایک دم انھوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر اپنے  
ہونٹوں پر اُننگلی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا۔ دل نے کہا مر گیا  
میں، آخر کیا ظلم! لال روشنی مینر پر ہوئی۔ پڑھنے کے لئے انھوں  
نے بھوت کی طرح ہاتھ سے اشارہ کیا۔ گلا روندھا، زبان  
لڑکھڑائی۔ لیکن جو پھر کھٹک کھلی تو تقریر ختم ہو گئی۔ لال روشنی  
کی جگہ ہرعی روشنی مینر پر ہوئی۔ انھوں نے کانوں پر سے آلہ  
اتارتے ہوئے کہا۔ ”ایک منٹ پہلے ختم ہوا“ گھڑی کی طرف  
دیکھنا چاہا کہ داہنی طرف سے ایک دوسرے صاحب نے  
میرے سامنے بہت سے کاغذات رکھدئے۔ ”بہت خوب!“  
جب تک بہت خوب، اور اس نئی مصیبت کا مفہوم سمجھتا تب  
تک انھوں نے مجھ سے دو جگہ دستخط کرائے تھے۔ داہنے ہاتھ  
سے چک دیتے ہوئے انھوں نے میرے سامنے بائیں ہاتھ  
پھیلا یا۔ جیب سے اتنی نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھتی تھی کہ پہلے

صاحب میرے واسطے کمرہ کا دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔  
جلدی سے باہر نکلا۔ دو قدم آگے چل کر جو میں نے اُن سے اپنی  
تقریر کے بارے میں دریافت کرنا چاہا تو مڑ کر دیکھ لوہ دونوں  
صاحب فائب ہو چکے تھے۔ پریشان ہو کر تیز قدم چلنے لگا۔  
ریڈیو ہاؤس کی میٹھیوں پر سے جس وقت اتر رہا تھا باہر برآمدہ  
میں 'مانکر و فون' گارہا تھا۔ "ہست بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے  
ہم نکلے۔"

## سوچ

یہ بھی زندگی میں کوئی زندگی ہوئی، سروجی بار بار یہی سوچتی۔  
 برابر یہی سوچا کرتی اور ہمیشہ سوچتی رہتی۔ جتنا ہی سوچتی اتنا ہی جیسے  
 سوچ اُسے کھائے جاتا۔ سوچ بدن میں گھن جیسا لگ جاتا  
 ہے۔ لیکن خیریت یہ تھی کہ ابھی سروجی کو اس کا احساس نہیں  
 ہوا تھا کہ وہ جس روگ کی ماری مر رہی تھی وہ دراصل کسی چیز  
 کے ہونے یا نہ ہونے کا دکھ اتنا نہ تھا، بلکہ اُس کی زندگی خود جو  
 اُس کے واسطے ہر چیز کی کمی کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوئی  
 تھی، اُس کے فکر کا کارن تھی۔ سروجی کے لئے یہ اچھا تھا کہ چونکہ  
 جس دن اُسے یہ معلوم ہو جاتا کہ دراصل جس روگ کے گھن اُسے  
 لگ گئے تھے وہ صرف فکر تھا تو پھر اُس سوچ کے روگ سے  
 وہ کبھی بھی نہ بچتی۔ غرض کہ سروجی جب اپنے اُس ذہنی ادھیڑ میں  
 میں لگی رہتی تو کبھی یہ ماننے کو تیار نہ ہوتی کہ اپنے سوچ کی وجہ

وہ خود تھی۔ بلکہ اپنی زندگی کو اُس فکر یا چنتا کی وجہ سمجھتی۔  
 سروج بابو ہمیشہ اُسے سمجھاتے کہ اُس کی ساری چنتا اور دکھ  
 کی وجہ وہ خود تھی کیونکہ ہر چھوٹی یا بڑی بات پر بے وجہ فکر  
 کرنے کی جیسے اُس کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ لیکن سروجنی اُس بات  
 کو مانتی بھی تھی کیسے جب وہ کئی سال تک اپنی اُس زندگی کو  
 جو اُس کی زندگی بن گئی تھی لگاتار دیکھتے رہنے کے بعد اس  
 نتیجہ پر پہنچی تھی۔ سروجنی کے لئے اچھا ہی تھا جو اُس نے  
 سروج بابو کی بات کبھی نہ مانی، کیونکہ سروج بابو تو ایسا کہ  
 کر جیسے اُسے زہری پلانے رہے تھے، جسے اگر وہ بغیر کسی  
 اعتراض کے پی لیتی تو سروجنی آج سروجنی کہاں ہوتی۔  
 اس درمیان میں مگر نے کھڑکی کے کونے میں کئی بار  
 گھوم کر اپنے آٹھ پھل کے مکان میں جالے کے چار تار اور  
 ڈال دیئے تھے۔ بیچ میں مگر کی بھاری پیٹ لئے بیٹھی تھیں  
 بھن کر رہی تھی۔ اور سروجنی نظر جمائے ایک ٹک دیکھ رہی  
 تھی۔ اُس کا بالیاں ہاتھ رہ رہ کر بچہ کی جانگمہ پر اب بھی پڑتا،  
 حالانکہ بچہ روتے روتے گود میں کب کا سو گیا تھا۔ بچہ سویا  
 تھا اور زندہ تھا اس وجہ سے معلوم ہوتا کہ سانس لینے کی

وجہ سے اُس کا پیٹ دھیرے دھیرے حرکت کر رہا تھا۔ سر جو جینی کی آنکھیں کھلی اور خاموش تھیں۔ اُس سے معلوم ہوتا کہ وہ جاگ رہی تھی۔ اُس کے زندہ ہونے کا ثبوت تو یہ تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر پر اُس کا داہنا ہاتھ سوسے ہوئے بچے کی جاناگھ پر اب بھی پڑتا تھا۔ جالے کے بیچ میں، موٹی مکڑی بھن بھن کر رہی تھی۔ مکڑا ہر لمحہ گھوم گھوم کر جالے کے آٹھ پہل مکان میں ایک تار اور ڈال دیتا تھا۔ سر جو جینی بیٹھی ایک ٹک زندگی کا وہ کماشہ دیکھ رہی تھی۔

کاش تم نے بھی کبھی بھول کر ہی سوچا ہوتا کہ ہم بھی آخر آدمی تھے۔ دکھ سکھ ہم کو بھی مارا اور جلا سکتا تھا۔ ہم بھی سکھ سے سکھی اور دکھ سے دکھی ہوتے تھے۔ ہماری بھی اپنی ایک زندگی تھی۔ لیکن تم نے اپنی زندگی کے آگے میری زندگی کو کچھ سمجھا نہیں۔ مگر آج میں کس سے اس کا رونا روؤں۔

مکڑے نے جالے کے آٹھ پہل کے مکان میں چکر لگا کر ایک اور جالے کا تانا تن دیا تھا اور مکڑی بیٹھی بدستور بھن بھن کر رہی تھی۔ سر جو جینی کا ہاتھ بچے کی جاناگھ پر جہاں دیر سے پڑتا تھا وہاں ہاتھ کے نیچے بچے کی جاناگھ پینے سے بھینگ

گئی تھی۔

لیکن تمھاری زندگی اسی رفتار سے چلتی رہی جو تم نے اپنے اور دوسروں کی زندگی کے لئے ضروری سمجھ رکھا تھا۔ میں بار بار تم سے کہتی رہی کہ دنیا ایسے ہی رہے گی، زندگی اپنی ہی رفتار سے چلے گی۔ تم اُس کی چال بڑھا نہیں سکتے۔ اس لئے اگر ہو سکے تو تم ذرا اپنی طرف بھی توجہ دو۔ اپنی طرف توجہ کر کے تم میری طرف بھی توجہ کرتے اور اس کی طرف بھی۔

سروجنی کا داہنا ہاتھ جو بچے کی جانگھ پر بے حرکت پڑا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اٹھ کر پھر گرتا اگر اسی وقت اُس کو اس کا احساس نہ ہو گیا ہوتا کہ بچہ سو گیا تھا، اور اب اور تھپکیاں دینے سے وہ سونے کے بجائے جاگ جائے گا۔ اُس کی جانگھ پر سے اُس نے آپنچل سے اسپینہ پونچھا۔ پھر آپنچل کا کونا آنکھوں تک لے گئی۔ لیکن آنسو کہاں تھے جو پونچھتی۔

مکڑا جالابن کر اپنا مکان آدھے سے زیادہ تیار کر چکا تھا۔ مکڑی بیچ میں بیٹھی بھن بھن کر رہی تھی۔

سروج بابو سے سروجنی کو جو بھی شکایت ہو، لیکن یہ نہیں  
 کہا جاسکتا کہ سروج بابو نے اپنی زندگی کامیاب اور سروجنی  
 کی زندگی سُکھی بنانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اصل میں  
 ایسا کون ہے جو جان بوجھ کر اپنی زندگی ناکامیاب بنا نا چاہتا  
 ہے۔ سروج بابو ہمیشہ ہی سوچتے اور آخر اس نتیجہ پر پہنچتے  
 کہ زندگی کامیاب یا ناکامیاب بنائی نہیں جاتی بلکہ وہ  
 کامیاب یا ناکامیاب ہو جاتی ہے۔ یعنی ہر آدمی اپنی اچھی  
 یا بری طبیعت اور عادتوں کا شکار ہو کر رہنا چاہتا ہے اور  
 عموماً رہتا ہے۔ اخیر میں انجام یہ ہوتا ہے کہ انھیں میں سے  
 کچھ کی زندگیاں کامیاب اور کچھ کی ناکامیاب ہوتی ہیں۔  
 یہ بات اس وجہ سے بھی صحیح ہے کہ ہر آدمی جو اپنی زندگی  
 کامیاب بنا نا چاہتا ہے اُس کی زندگی ہمیشہ کامیاب  
 نہیں ہوتی۔ بلکہ کفایت اور کنجوسی کرتے کرتے لوگ فاقہ مست  
 ہو جاتے ہیں۔ بیچ بولے اوسے انداز میں کرتے کرتے لوگ  
 مہاجنوں اور ساموکاروں کے ہاتھوں بک جاتے ہیں۔  
 محنت اور مشقت سے کام کرنے والے مَر جاتے ہیں، لیکن  
 اپنے بچوں کے واسطے ہمیشہ پاس ایک میں روپیہ نہیں چھوڑ

جاتے۔ سروج بابو نے جہاں یہ سب دیکھا تھا وہاں اٹھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ جوڑی اکثر لکھتی ہو کر مرے۔ فریبی اور دغا بازوں نے زندگی محسّری سے شروع کر کے اُسے ریاست کی دیوانی پر حتم کی۔ جال کرنے والے اور دھوکا دینے والے عام طور سے کامیاب رہے۔ اور نہیں بھی کامیاب رہے۔ اور جب کوئی ٹھگ اونچے درجہ پر پہنچ گیا تو جو میوں نے اُس کا ہاتھ دیکھ کر بتایا کہ اُسے کڑوڑ پتی ہونا لکھا تھا۔ سب کرموں کے پھل ہیں!

سروح بابو جب بھی سروحی اور اُس کی زندگی سے پریشان ہو کر سوچتے تو اسی نتیجہ پر پہنچتے کہ زندگی کامیاب بنائی نہیں جاتی، وہ کامیاب ہو جاتی یا نہیں ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ اگر وہ سروحی کو آسودہ اور خوش کرنے کی کوشش بھی کرتے تو کیا کرتے۔ سروحی چاہتی بھی تو کوئی ایک چیز نہیں تھی۔ وہ کھانے کو کھانا، پینے کو کپڑا، رہنے کو مکان، کام کرنے کو نوکر، جلانے کو لکڑی، اور پینے کو سالہ چاہتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ اُسے زکام نہ ہو، اُس کا بچہ دُبا اور بیمار نہ ہو، محلہ میں شور اور غل نہ ہو، راتیں اتنی

اندھیری نہ ہوں، چاندنی اُجیالی نہ ہو۔ خود سر و جہنی ایسی نہ ہو اور سر و جہ بابو جیسے تھے ویسے نہ ہوں۔ چنانچہ سر و جہ بابو بار بار یہی سوچتے کہ اگر مُر کھپ کر کسی صورت سے وہ زندگی کامیاب بھی بنالیں، یعنی اُس زندگی میں سوکھی لکڑی، گرم مسالہ، ٹھنڈے کپڑے اور بیماریوں کو اچھی کرنے والی دوائیاں ہتیا بھی کر لیں تب بھی سر و جہنی کو خوش کرنے کے لئے سورج نکلنے کا وقت کیسے بدلی سکتے تھے، درختوں کو چھوٹا یا بڑا کیسے کر سکتے تھے، سر و جہنی کو کیسے کچھ اور بنا سکتے تھے، یا خود اپنے کو کیوں کر بدل سکتے تھے۔ جب وہ اس طرح سوچتے تو آخر میں پریشان ہو کر ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہنچتے، یہی زندگی ہے، وہ ایسی ہی ہوتی ہے اور ایسی ہی رہتی ہے۔ لیکن جب وہ اتنے اُس نتیجہ پر پہنچتے تو اُس وقت انھیں اپنی زندگی کا وہ پورا ڈرامہ یاد آنے لگتا جس کے خاص منظروں کو جیسے اُن کے کانوں میں کوئی اونچی آواز سے انھیں سناتا ہوتا۔

تمھاری زندگی کب اور کیسے شروع ہوئی، یہ تم نہیں جانتے۔ کب اور کہاں ختم ہوگی یہ بھی تم نہیں جان سکتے۔ تم جو جانتے ہو وہ بس یہی ہے کہ نویں درجہ تک تم کھاتے پیتے

اور پڑھتے لکھتے رہے اس لئے کہ تمہارے ماں باپ کی اتنی حیثیت اور ایسی مرضی تھی۔ پھر زندگی کا چکر چلا اور تم سمجھتے ہو کہ اُسے تم نے چلایا۔ لیکن یہ تم کیا جان سکتے ہو کہ اس دنیا اور اس زندگی کا چکر کون چلاتا ہے۔ بہر حال جو تم سمجھتے ہو وہ تم بھی سمجھتے پر مجبور ہو اور وہ تم سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ درجہ میں کاشی ناتھ تم سے دُور بیٹھا تھا۔ لیکن اُس سے دُور رہ کر بھی تم اُس کی طرف کھینچنے سے اپنے کو روک نہ سکے۔ تم سوچتے ہو کہ کاشی ناتھ کی طرف جو تم اتنے کھینچ گئے وہ اُس کی ذات کی کشش تھی۔ جو بھی ہو۔ چوڑے اور ابھرے ہوئے سینے کے کاشی ناتھ نے جب تمہیں اپنی طرف کھینچتے دیکھا تو اُس نے تمہیں پرکھنا چاہا کیونکہ کاشی ناتھ کی رائے میں آدمی آدمی نہیں ہوتے تھے بلکہ لوہے یا لکڑی کے ٹکڑے تھے۔ اس لئے جس طرح لوہے یا لکڑی کے ٹکڑے کو ٹھونک پیٹ کر اُن کو جس لایت پالیا جاتا ہے اُن سے ویسا کام لیا جاتا ہے، اُسی طرح وہ آدمی کو پرکھ کر اُس کو جس لایت سمجھتا تھا اُس سے ویسا کام لیتا تھا۔ جس قسم کا اُس کا کام تھا اُس میں ضرورت ہر طرح

کی چیزوں کی بھی۔ یعنی اُسے مٹی کی بھی ضرورت تھی، لکڑی کی اور لوہے کی بھی۔ چنانچہ اُس نے تمھیں لکڑی سمجھ کر لکڑی کی طرح پرکھنا چاہا، کیونکہ لکڑی بھی طرح طرح کی ہوتی ہے۔ کوئی شیشم ہوتی ہے تو کوئی آم، جو جلانے میں اچھی ہوتی لیکن زمین پر پٹکنے پر کھٹ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اِطلی کی لکڑی خوب جلتی ہے، نیم کی جلتی بھی نہیں، لیکن اُس میں دیمک نہیں لگتی۔ لکڑیوں میں ساکھو ستو سال کھڑا رہتا ہے، سو سال پڑا رہتا ہے اور سو سال میں سڑتا ہے۔ لکڑی کی طرح آدمی بھی ہوتا ہے۔ اِس لئے اُس کی پہچان بھی لکڑی کی طرح ہونی چاہئے، کاشی ناتھ کا ایسا خیال تھا۔

چنانچہ اِس پہچان کی غرض سے کاشی ناتھ جب اُس بھوت والی کوٹھی کے پیچھے آم کے باغ میں مالی کی خالی کوٹھری میں اکیلے رہتا تھا تو اُس نے تم سے بتایا کہ اُس سے اگر تم ملنا چاہو تو صرف ۹ بجے رات کو مل سکتے تھے۔ بھوت والی بڑی کوٹھی جب سے بنی تھی تب ہی سے خالی تھی۔ اُس میں نہ کبھی کوئی رہا اور نہ کسی کی رہنے کی ہمت ہو سکتی تھی۔ پیچھے آم کے درختوں کا اندھیرا باغ تھا،

جو چار دیواری سے گھرا تھا۔ باغ کے بیچ میں کاشی ناتھ اس دیران کو ٹھہری میں رہتا تھا جو باغبان کے رہنے کے لئے بنی ہوگی۔ معلوم نہیں کاشی ناتھ وہاں اپنے کام کی سہولت کی غرض سے شہر سے اتنی دور رہتا تھا یا اس وجہ سے کہ اُس کو ٹھہری میں رہنے کا اُسے کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ بہر حال تم سے جب اُس نے کہا کہ نو بجے رات ہی کو اُس سے تم مل سکتے تھے تو تم نے یہی سمجھا کہ بقیہ وقت کاشی ناتھ مشغول ہونے کی وجہ سے کہیں اور رہتا تھا۔ اگر تمہیں اس میں کچھ شبہ ہو سکتا تھا تو وہ شبہ اُس رات کو دور ہو گیا جب غلطی سے نو بجے کے بجائے دس بجے رات کو اُس اندھیری کو ٹھہری میں داخل ہو کر تم نے دیا سلائی جلانے کے بعد دیکھا کہ کاشی ناتھ بیچ کمرہ میں پیر اوپر کئے آنکھوں کے سامنے بھگوت گیتا کھولے سر کے بل کھڑا تھا۔ وہ منظر دیکھ کر تمہاری توجان ہی نکل گئی۔ لیکن جب کاشی ناتھ نے تم سے بتایا کہ اس طرح اندھیرے میں وندنا کرتے وقت وہ اُٹتی آنکھوں سے بھگوت گیتا پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا تب تمہاری سمجھ میں آیا کہ جو شخص اس طرح اپنی جسمانی اور روحانی طاقتوں کو برچی کی نوک کی طرح تیز کرتا ہو وہ رات کے نو بجے کے علاوہ کسی اور وقت تم سے مل بھی کیسے سکتا ہے لیکن دراصل

کاشی ناتھ تمھیں لکڑی کی طرح زمین پر پٹک کر پرکھ رہا تھا یہ تو تمھیں پلیگ کے مریض کاشی ناتھ کے واسطے اندھیری راتوں میں بارہ روز تک کھانا پہنچانے کے بعد معلوم ہوا جب موت کے منہ

سے نکل کر کاشی ناتھ نے مسکرا کر تم سے کہا۔ "تم ڈرے نہیں۔"

لکڑی سے کام اُسکی نوت پہچان کر ہی لیا جاتا ہے چنانچہ یہ خبر آئی کہ شیکھر دادا پولیس کی گولی کے نشانہ بنے تو یہ کام تمھارے ہی سپرد کیا گیا کہ تم ایک سوچو بیس میل سائیکل پر جا کر اس کی تصدیق کرو کہ وہ شیکھر ہی دادا تھے یا کوئی اور شخص تھا۔ ریل سے نہیں کوئی جاسکتا تھا کیونکہ اس قسم کی خبر اخبار میں نکلا جاتا پولیس کی چال بھی ہو سکتی تھی۔ جب کوئی ریل سے خبر کو تصدیق کرنے کے لئے روانہ ہوتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا اور پھر اس طرح سارے انقلابیوں کا پتہ چل جاتا۔ لیکن جب تم دو سو اڑتالیس میل سائیکل چلا کر یہ خبر لائے کہ پولیس کے مقابلہ میں پستول چلاتا ہوا جو شیر زمین پر گر اٹھا وہ شیکھر ہی تھا تو یہ ضروری ہو گیا کہ اس کی جگہ امید سنگھ لے لے اور امید سنگھ کی جگہ کاشی ناتھ کو دیدی جائے اور کاشی ناتھ کی باغ والی کو ٹھہری تمھارے سپرد کر دی جائے۔

اندھیری کو ٹھہری میں جب تم سر کے بل کھڑے ہو رہے تھے

اور بھگوت گیتا اور سوامی ویویکانند کی کتابیں پڑھ رہے تھے اسی  
 زمانہ میں بھوت والی کوٹھی میں وہ نیا بنک کھلا۔ بنک کھلنے سے  
 پہلے بھوت والی کوٹھی میں لکھی کی پوجا ہوئی۔ اُس پوجا اور پرارتھنا کی  
 وجہ سے معلوم نہیں کوٹھی چھوڑ کر بھوت بھاگ گیا یا نہیں۔ لیکن شاید  
 یہ سوتج کر کہ جہاں لکھی رہیں گی وہاں بھوت نہیں رہ سکے گا بنک  
 کے نیچر صاحب کوٹھی کے پیچھے کے حصے میں رہنے کے لئے  
 آئے۔

اُس وقت سر جینی کا نام سر جینی نہیں تھا۔ اُس کا اصلی نام  
 مُتی تھا۔ سر جینی نام تو تم نے اپنی سہولت کے لئے رکھا۔ لیکن یہ  
 مُتی کے پجاجی کو بھی کہاں معلوم تھا کہ مُتی کا نام سر جینی تم نے  
 رکھا تھا۔ بنک کے نیچر صاحب تو یہی سمجھے تھے کہ کو تیا لکھنے کے  
 لئے مُتی نے اپنا دوسرا نام سر جینی رکھ لیا تھا۔ اُنھیں کیا معلوم  
 تھا کہ مالی کی کوٹھری میں سے سوامی رام تیرتھ، لاجپت رائے اور  
 سندر لینڈ کی کتابیں لا کر مُتی کرانت کاری بن گئی تھی۔ سر جینی نام  
 رکھا گیا تھا، سی۔ آئی۔ ڈی کو دھوکا دینے کے لئے۔ وہ سر جینی  
 تو صرف دھوکے کی اٹھی تھی۔ اصلی سر جینی تو تم تھے جو باغ کی  
 اندھیری کوٹھری میں بیٹھے، پیکرک ایسڈ، کے دھوئیں اٹھایا

کرتے تھے۔

لیکن یہ تم نے نہ سوچا کہ بینک کے منیجر کے گھر میں جو دھواں  
 سروج کے دل میں اُس وقت اُٹھ رہا تھا وہ ہر طرح سے تمہاری  
 زندگی اور تمہارے مستقبل کے واسطے زیادہ اہمیت رکھتا تھا بہ  
 نسبت اُس تیزابی دھوئیں کے جو تمہاری کوٹھری میں پارہ بیکے  
 رات کے بعد اُٹھتا تھا۔ تم سروج سے مل کر اتنے خوش ہوے کہ  
 جلد ہی تمہارے دل میں بھی وہ سروجی بن گئی۔ تم نے سوچا کہ  
 ایک چیون ساٹھی پا کر تو دشمن کے تم پیر ہی میدان سے اٹھاؤ  
 دو گے۔ ہمت سنگھ نے اشارہ ضرور کیا کہ جو کچھ کرنا وہ سوچ سمجھ کر  
 کرنا اس لئے کہ شیکھ داد اپنی زندگی میں ہمیشہ پارٹی میں عورتوں  
 کے آنے کے خلاف رہے۔ لیکن تم نے سب کو یہ سمجھایا کہ سروجی  
 کی وجہ سے کام میں بڑی آسانی پیدا ہو جائے گی۔ مگر جہاں تم نے  
 ہمت سنگھ کو اس طرح خاموش کر دیا وہاں تم سروجی کے دل کو  
 خاموش نہ کر سکتے جو تمہارے دل سے مستقبل خاموش باتیں کرتا رہا۔  
 تم اُس وقت یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ جو تم اتنے جلد سروجی سے  
 مل کر ایک ہو گئے تھے اُس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ انقلابی کام  
 اُس کے بغیر چل نہیں سکتا تھا یا اُس کی وجہ سے وہ کام

زیادہ تیز چلنے لگا تھا، بلکہ سر و جہتی کے ایک اشارہ کو تمھاری آنکھوں نے دواس وجہ سے سمجھنا چاہا کہ تمھاری زندگی اینٹ کی طرح سخت تھی، سر و جہتی کی گلاب کی پنکھڑیوں جیسی ملائم تھی، تمھاری زندگی کاٹھا تھی، اُس کی کلی تھی، تمھاری زندگی تیزاب تھی اور اُس کی کیمیا تھی۔

لیکن جس لکڑی کے ٹکرے کو کاشی ناتھو نے شیشم سمجھا تھا وہ ساکھو ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ رام تیرنڈ اور ویوکیا نند کے پیغام بھی تم کو اُس راستہ سے چلنے سے روک نہ سکے جس سے سر و جہتی تم کو چلانا چاہتی تھی۔ اور جب تم نے سر و جہتی کی ضد کے جواب میں لفظ دہاں، اپنی زبان سے نکالا اُس وقت بھی تمھاری اندھیری کوٹھڑی کے طاقوں پر میزی کی تقریریں، گیری بالڈی کی انقلابی کہانی، ویو افکنہ کی سوانح عمری، اور آئر لینڈ کی عدالت میں راجر کیس منٹ کے بیان کی جلدیں رکھی تھیں۔ تمھارے ماں باپ نے بھی، چاہے وہ جہاں رہے ہوں، تمھارے اُس ہاں کو سنا ہوگا۔

اگر تم بنگال چلے گئے ہوتے تب بھی وہ انقلابی آگ، جو اُس وقت یک یک بھرٹک اٹھتی تھی، مجھنے سے رکتی نہیں۔

اس بہاری نے جو دیکرک ایسڈ کا نسخہ بنگال کو دیا تھا وہ  
 تمہارے اور سرجنی کی کیمیا سے کہیں زیادہ جاندار اس وقت  
 بھی تھا۔ لیکن تاریخ ہر نسخہ کو بدل دیتی ہے۔ اس لئے وہ آگ  
 جلد ہی بجھ گئی۔ لیکن اس سے بھی پہلے تم بچ گئے۔ کاشی ناٹھ  
 نے دوڑ دھوپ کر تمہیں سودیشی بینک میں نوکری دلادی۔  
 یہی اس کے لئے کیا کم تھا۔ تمہارے کوٹ کی داہتی جیب میں نہ  
 اب ریوالور تھی اور نہ بائیں جیب میں سلفیورک ایسڈ نیم فتر  
 میں بیٹھے دوسروں کے بینک بلینس جوڑتے گھٹاتے رہتے  
 تھے۔ سرجنی کا بدن اب انقلابی اشتہاروں سے نہیں بلکہ  
 زندگی کے سوچ سے بھاری رہتا تھا۔ لڑکے کا نام کرائی تم  
 نے رکھا۔ لیکن چھ مہینے کا تھا کرائی بھی تمہاری بینک کی نوکری  
 اور سرجنی کی تقدیر میں کیا انقلاب پیدا کر سکتا تھا۔ انقلاب  
 کا وقت اہل میں گزر گیا تھا۔ اب تو تمہیں جتنے دن جینا تھا  
 اتنے دن ایک روپیہ تین آنہ یا ایک روپیہ پانچ آنہ روز کما کر  
 جینا تھا۔ جس دن تم ٹکے سیر بھنڈی کے بجائے ایک آنہ سیر آلو  
 شام کو بازار جا کر خریدتے تھے وہ دن تمہاری زندگی میں  
 انقلابی ہوتا تھا۔

آواز خاموش ہو گئی تھی۔ زندگی کا چراغ بجھ گیا تھا۔ مگر اے  
 جالابن کر چلا گیا تھا۔ مگر پی اکیلے بیٹھی بھن بھن کر رہی تھی۔  
 سر و جہنی کھڑکی کے کونے میں جا لے پر تکتے تکتے جیسے یک بیک  
 نیند سے جاگ اٹھی۔ پیٹ میں جیسے کچھ کھلا آیا۔ ایک دم وہ کانپ  
 گئی۔ بچہ کو لے جا کر چار پانی پر لٹا کر خود پیٹی پر بیٹھ گئی۔ بیٹھی رہی  
 اور سوچتی رہی۔ اپنے دل کی بات کیسے اور کس سے بتاتی۔

سر و جہنی کے سوچ سے سر و جہنم یا بود دفتر میں سوچتے سوچتے  
 مر گئے۔ لیکن سر و جہنی کا سوچ آج بھی نہ گیا۔ وہ یہی سوچ رہی  
 تھی کہ آدمی کا پیشہ بھلے ہی چھوٹ جائے لیکن اُس کی عادت  
 نہیں چھوٹی۔ چنانچہ جہاں وہ انقلابی کتابیں، پستول، ریوالور  
 اور تیزاب سب پیچھے چھوٹ گئے تھے وہاں سر و جہنم یا بود کا شام  
 کے وقت دریا کا نہانا اب بھی نہیں چھوٹا تھا۔ کئی دن سے  
 طبیعت بھاری رہ رہی تھی۔ لیکن حرارت کی شکایت کس سے  
 کرتے۔ سر و جہنی اپنی ہی زندگی کی حرارت میں تپ رہی تھی۔  
 اس لئے اُس سے اپنے بخار کا حال کہہ کر وہ اپنا بخار بھلا  
 کیا کم کرتے۔ سر و جہنی جہاں اُنھیں اور بہت سے کام کرنے  
 سے منع کرتی تھی وہاں اُسے اُن کا دریا نہانے جانا بھی پسند

نہ تھا۔ لیکن، وہ سوچتی، سرورج بابو اُس کا کتنا مانتے ہی کہاں  
تھے جو یہ مان لیتے۔

اُس شام کا نہانا جیسے اُن کے لئے کال ہو گیا۔ تیز بخار  
جب ہلکا ہوتا تو وہ سوچنے کی کوشش ضرور کرتے۔ لیکن بخار  
نے دماغ بیکار کر دیا تھا۔ جب سوچنے کی کوشش کرتے تو وہ  
محسوس کرتے جیسے اُن کے اندر ایک ڈر سما گیا ہے۔ اسی  
وقت سر ہانے بیٹھی سرورجی دکھ کی آواز سے کہتی۔ ”تم سے  
کہتی رہ گئی کہ دریا کا نہانا چھوڑ دو۔ سرورج بابو اُس وقت  
یہ سوچتے کہ اگر وہ شام کو دریا میں نہ نہاتے تو سرورجی کی دی  
ہوئی اپنی زندگی کی حرارت کیسے کم کرتے۔ پھر وہ چار پانی پر  
پڑے پڑے کمرہ کے چاروں طرف دیکھتے اور ایک انجان ڈر  
سے کانپ اٹھتے۔ بخار تیز ہو جاتا اور آنکھیں بند ہو جاتیں۔  
سرورج بابو کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ ماں باپ بیچاروں  
سے جو کچھ ہو سکا اٹھوں نے وہ کیا۔ لیکن مرنا جیسا کس کے  
بہن کا ہوا جو اُن کے بس کا ہوتا۔ چنانچہ جب ڈاکٹر نے  
آرے سے سینہ جانچ کر اور نبض دیکھ کر کوئی دوا نہیں تجویز کی  
تو سرورج کے ماں باپ نے یہی سوچا کہ نہ اُس کی زندگی

میں وہ کچھ کر سکے اور نہ آج اُس کے مرنے میں کچھ کر سکتے ہیں۔

جس وقت سروج بابو کی آنکھیں سروجنی کے چہرے پر سے ہٹ کر چھت کی طرف رُخ کرنے لگیں تو اُس کی زبان سے صرف اتنا سنائی پڑا۔ ”سروجنی میں اور کچھ نہیں کر سکا۔ کاشی ناتھ۔“

سروجنی چار پائی کی پٹی پر سے اٹھی اور کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ مگڑی کے جالے میں ایک بڑا سا مکھا اُگر پھنس گیا تھا۔ لیکن مگڑی جب تک اُسکے گرد جالا بن کر اپنے جالے میں اُسے پھنسا پاتی تب تک مکھا جالا بھاڑ کر نکل گیا تھا۔

جس وقت سروج بابو کی لاش آٹن سے اٹھنے لگی سروج کے چھوٹے بھائی نے ڈھائی سال کے کرائنتی کو لاکر اُس کے ہاتھ سے اُس بانس کو مچھلا دیا جس پر رکھ کر چار آدمی سروج بابو کی مٹی کو اٹھا رہے تھے۔ سروجنی نے لاش اُٹھتے وقت جب یہ چاہا کہ دروازہ زبردستی کھول کر آنگن میں چلی جائے تو اُس وقت وہ صرف اتنا دیکھ سکی تھی۔ عورتوں نے اُسے

اندر کھینچ کر باہر سے کٹڈی چڑھا دی۔

جب سردج بابو کو اُس دریا میں ڈال کر لوگ آگے بڑھے  
اُسے انقلابی اندھیری کو ٹھہری میں رہنے کے زمانہ سے پسند  
تھا، تو عورتیں سر و جینی کو پکڑ کر اُسے آنگن میں نہلانے لگے  
لئے لے گئیں۔ لیکن جب سر و جینی نے اپنا سہاگ دھونے  
کے لئے ہاتھ سے لوٹے کا پانی اٹھایا تو گھر کی عورتیں بھاگ  
کر کمرہ میں چھپ گئیں۔ جس کا شوہر زندہ ہو گا وہ ایسا بد  
شگون کیوں دیکھے گا۔ جب سر و جینی ماتھے کا سینڈر دھو کر  
بغیر کنارے کی ساڑھی پہن چکی تو گھر کی عورتیں آنگن میں آئیں۔  
پھر اُسے ایک چھوٹے کمرہ میں لے جا کر آنکھوں نے بیٹھا  
دیا۔ آٹھ دن اسی کمرہ کی فرش پر سر و جینی پڑی رہی۔ کراتی کو  
لوگوں نے اُس سے الگ کر دیا تھا۔ جب وہ بہت روتا تو  
اُسے لاکر عورتیں سر و جینی کا بدن اُس سے پتھوڑا لے جاتیں۔  
دسویں دن سر و جینی کو زندگی میں پھر سے ایک بار رنگین ساری  
پہنائی گئی۔ پھر چوڑیاں پہنائی گئیں۔ ماتھے میں سینڈر اور  
پیر کی انگلیوں میں سُرخ رنگ لگایا گیا اس کے بعد وہ  
سینڈر پھر سے دھویا گیا۔ رنگ کو لے سے رگڑ رگڑ کر مٹایا

گیا۔ چوڑیاں پتھر سے ایک ایک کر کے چور کی گئیں۔ رنگین ساڑھی اتار کر اسے سفید ساڑھی پہنائی گئی۔ گھر کی دوسری عورتوں نے رنگین ساڑھیاں پہنیں، ہاتھے سینڈل سے رنگے، پیرکلاہی رنگ سے چمکائے۔ جس کا مرد نہیں تھا اُس نے وہ کیا۔ جن کے مرد تھے اُنھوں نے یہ کیا۔ سروجنی ہندو گھر کی وِدھوا ہے اس لئے بغیر کنارے کی سفید ساڑھی پہنے سوچتی ہے۔ دنیا کے مرد مر جائیں گے عورتیں بھی مر جائیں گی۔ لیکن یہ نہ مرے گا۔

سروج بابو کے مرنے کے بعد کاشی ناتھ جب ضمانت پر چھوٹے تو سروجنی سے ملنے آئے۔ باہر کچھ دیر سروج بابو کے پتا سے بات چیت کرتے رہے۔ پھر جب اُنھوں نے سروجنی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اُن سے بتایا گیا کہ یہاں یہ رواج نہیں ہے۔ کوئی باہر کا آدمی گھر کی بہو سے نہیں مل سکتا تھا۔ کرتے کیا چپ ہو گئے۔ حالانکہ جب سے لُھوں نے یہ سنا تھا کہ سروج بابو مرتے وقت اُنھیں کا نام زبان پر لائے تھے وہ سروجنی سے مل کر جاننا چاہتے تھے کہ آیا وہ جینے والوں کے لئے کچھ کر سکتے تھے۔

سروج بابو کی جو کمائی سروجتی کی کسی بھی ضرورت کو پوری نہ کر سکی اس کی قیمت کا احساس آج سروج کے نہ رہنے پر اس کے والد کو ہو رہا تھا۔ پنشن اتنی نہیں تھی کہ بیچارے گھر کا خرچ چلا سکتے۔ چھوٹا لڑکا ابھی ملازمت کی تلاش ہی میں تھا۔ ایسی حالت میں سوائے خرچ گھٹانے کے آمدنی بڑھانے کی کہاں سے سوچ سکتے تھے۔ اس لئے تھوڑے کرایہ کے مکان کی تلاش میں تھے اور اسی سوچ میں سارا دن تھمتے پیتے پیتے بیتا دیتے تھے۔ بی بی اندر سے بار بار آکر ڈیوڑھی میں کھڑی ہو کر سمجھا جاتیں۔ ”مکان لیتے وقت خیال رکھنا کہ اغل بغل کے مکان میں کوئی نوجوان آدمی نہ ہو۔“

جس مستعدی سے چھوٹا بھائی ملازمت ڈھونڈنے میں لگا تھا اسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ سروج بابو کی موت کا سب سے زیادہ اثر اسی پر پڑا تھا۔ بھابھی کے پاس جا کر اکثر بیٹھتا اور ڈھارس بندھانے کی کوشش کرتا۔ ماں کو یہ بات کم پسند آتی۔ چنانچہ محلہ کی عورتیں جب گھر میں آتیں تو اسے سنا سنا کر وہ کہتیں۔ ”بوتشی نے جنم پتری دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ اگر ہمیں شادی کی ذرا بھی خبر ملتی تو ہم ایسی جگہ ہرگز لڑکے کی شادی

نہ ہونے دیتے۔ چھوٹا بھائی اس قسم کی باتیں گھر میں آتے جاتے سنتا اور سنی کو ان سنی کر دیتا۔ ماں پر حیرت کرتا۔ کہاں سے انھیں بھابھی کی کنڈلی مل گئی جو یہ اسے پنڈتوں کو دکھاتی پھر رہی ہیں!

سروجنی سوئے ہوئے کرانتی کے سر ہانے چار پائی پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ آخر وہ کب تک اس سوچ سے مرگی۔ جب سے سروجنی بابو کی ماں کو یہ معلوم ہوا تھا کہ سروجنی کے پیٹ میں بچہ ہے تو وہ اس سے دن میں اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم دو بار ضرور پوچھتیں کہ بچہ کب تک پیدا ہوگا۔ سروجنی بالکل ٹھیک تاریخ بتا بھی کہاں سے دینی۔ اس سے وہ اور کڑھتیں۔ پھر اپنے من سے اٹا سیدھا مہینوں کا کچھ حساب جوڑ کر ڈیوڑھی میں جاتیں اور اپنے بوڑھے سے کہتیں۔ ”معلوم تو سروجنی ہی کا ہوتا ہے۔“

چھوٹے بھائی کی پریشانی اور سوچ نوکری پا کر بھی نہ ختم ہوئے۔ کم تنخواہ میں سروجنی اور اس کے بچے کے لئے کر بھی کیا سکتا تھا۔ جو کچھ پاتا باپ کو لا کر دیتا۔ روپیہ جب ہاتھ میں آیا تو ماں باپ چھوٹے لڑکے کی شادی کی

فکر میں پڑے۔ لڑکے نے جب یہ سنا تو اُس پر وہ سوچ  
 سوا ہوا کہ سر و جہنی کے سارے سوچ کو وہ بھول گیا۔  
 اور سر و جہنی کو جب یہ معلوم ہوا کہ برصغیر کے علاوہ ایک  
 اور سہاگن گھر میں آرہی ہے تو اُس نے سوچ سے وہ  
 کانپ کر رہ گئی۔



# میں کیسے لکھتا ہوں۔ کہانی

خیریت ہوئی سوال یہ پوچھا گیا کہ میں کیسے لکھتا ہوں،  
ورنہ اگر یہ پوچھ لیا گیا ہوتا کہ آپ لکھتے کیوں ہیں تو کم سے  
کم میری تو گت بن گئی ہوتی۔ جہاں دنیا میں ہزاروں اور  
کام ہیں وہاں کچھ لوگ خواہ مخواہ قلم ہی گھسنا اپنا پیشہ  
کیوں بنا لیتے ہیں، یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ اور اگر قلم  
چلانا اپنا پیشہ بنا کر یہ لوگ اپنی بلا سے جیتے مرتے تو کسی کو  
اعتراض بھی کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن مصیبت اُس وقت پیدا  
ہوتی ہے جب یہ لوگ سماج اور سکے کو اندھا قرار دے کر  
دنیا کو راستہ دکھانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ  
اپنی نظر میں اس نہایت ہی نیک کام کے لئے یہ لوگ یہ بھی  
چاہتے ہیں کہ دنیا والے ان کے اور ان کے بچوں کے پیٹ

بھریں اور اُنھیں تو شمال رکھیں۔ اور اگر کبھی ایسا نہیں ہو پاتا ہے تو یہ لوگ دنیا کو اور دنیا میں رہنے والوں کو بڑی بڑی لمبی زبانوں سے کوستے اور گالیاں دینے لگتے ہیں، اُنھیں گنوار اور مورکھ کہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان سے یہ ضرور پوچھا جاسکتا ہے کہ آخر یہ لکھتے ہی کیوں ہیں۔

لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ میں کیسے لکھتا ہوں۔ جہاں تک میرا سوال ہے، میں تو بس ایسے ہی لکھتا ہوں، یعنی جیسے لکھا جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قلم اٹھا کر کاغذ پر چلانے لگتا ہوں۔ قلم خراب یا ٹوٹا نہیں ہوتا تو چلتا جاتا ہے اور میں اسے چلانا جاتا ہوں۔ اکثر قلم روک کر دیکھتا بھی ہوں کہ کیا اور کیسا لکھ رہا ہوں۔ اگر لکھی ہوئی چیز میں کچھ تک نظر آتا ہے تو مطمئن ہو کر اور لکھتا ہوں اور اگر زیادہ تک نہیں نظر آتا تو کاغذ قلم الگ پھینک کر چھڑی اٹھا کر گھومنے چلا جاتا ہوں۔

بہر حال، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آدمی کو کرنے کے لئے بہت کام ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر ان میں سے کچھ ہی کام کر سکتے ہیں، بقیہ کام یا تو اُنھیں آتے نہیں یا وہ کرنا نہیں

چاہتے۔ اس کے علاوہ طبیعت کا بھی سوال ہوتا ہے۔ جب جس کام میں جی لگتا ہے آدمی اُس وقت وہی کام کرتا ہے۔ جسے لکھنا آتا ہے وہ بھی ہر وقت لکھتا ہی نہیں رہتا۔ بلکہ جب جی چاہتا ہے تب ہی لکھتا ہے۔ لکھتے وقت لکھنے کے نتیجہ کو بھی سوچتا جاتا ہے۔ اگر اچھا لکھتا ہوتا ہے تو اور لکھتا ہے، ورنہ لکھنا چھوڑ کر کسی اور کام یا تفریح میں لگ جاتا ہے۔ خود میرے ساتھ ایسا اکثر ہوا ہے کہ سڑک پر ٹہلتے ٹہلتے جب اور ٹہلنے میں جی نہ لگا تو گھر آکر لکھنے لگا ہوں۔ کہانیاں عموماً میں نے اسی طرح لکھی ہیں۔

ویسے جو پہلی کہانی میں نے لکھی وہ تو ایک صاحب سے بازی لگا کر لکھی تھی۔ اُن صاحب کا یہ خیال تھا کہ میں کہانی نہیں لکھ سکتا تھا کیوں کہ اُن کی نظر میں کہانی لکھنے کے لئے ایک قسم کے فطری رجحان کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالانکہ خیال میرا بھی کچھ اسی قسم کا تھا لیکن، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مقالے میں آدمی دریا میں کود پڑتا ہے۔ اس لئے شام سے میں کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ لیکن ایک آدھ جملے کے بعد قلم چلائے نہ چلا۔ سوچتا رہا۔ لیکن سوچتا بھی کیا؟ کچھ ہوتا تب تو

سوچتا۔ کبھی 'سیرو'، جنوں، کبھی 'ہیروئن'، بن جاؤں لیکن گاڑی کسی صورت سے آگے نہ بڑھے کھانا کھانے کا وقت آیا۔ لیکن کھانے سے انکار کر دیا۔ بجلی کا لیمپ سر ہانے رکھوایا۔ ایک ڈبیہ سگریٹ اور دیاسلانی تکیہ کے پاس رکھے گئے۔ تو کر کو مکان سے نکال کر باہر کیا۔ پھر دروازے بند کر لئے۔ اس طرح شام ہی سے گھر کا چراغ باہر گل کر کے اندر کمائی لکھنے بیٹھا۔ اس کا خیال نہیں رہا کہ کب تک اور کیا لکھتا رہا۔ رات زیادہ بانی نہیں رہی، یہ اُس وقت معلوم ہوا جب میں اپنی کمائی کے دوران میں صوفیہ پر ایک کتابنا بیٹھا بھونک رہا تھا اور مجھ سے بہت دور کسی دربیہ کی تازیک تہنائی میں کوئی مرغ آنکھیں بند کئے بانگ دے رہا تھا۔

لوگوں کا کہنا ہے، بڑھاپے کا شوق بھی بڑا شوق ہوتا ہے، یعنی ایک بار جب پیدا ہو جاتا ہے تو ختم ہونا نہیں جانتا۔ لیکن وہ بڑھاپا نہیں بلکہ میری جوانی تھی۔ اور جوانی کا شوق آدمی کو کس کس گھاٹ پانی پلواتا ہے یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ چنانچہ جہاں اور مرض پال رکھے تھے وہاں یہ نیامرض پیدا ہوا۔ جب دیکھے کسی نئے افسانہ کے ادھیڑ بن میں

لگا ہوں۔ ٹہلنے جاتا ہوں تو جیب میں نوٹ بک لے۔ جو چیز ذرا عجیب لگتی ہے اُس کے بارے میں اپنا عجیب ذہنی رد عمل نوٹ کر لیتا تھا۔

یہ بات ذرا غور کرنے کی ہے۔ افسانوں کے واسطے دنیا اور زندگی کی عام چیزیں بے معنی ہی نہیں بلکہ عام طور سے غیر ضروری ہوتی ہیں۔ صرف غیر معمولی چیزیں اکثر دماغ پر اثر کرتی ہیں۔ یا اگر معمولی چیزوں کے بارے میں ذہنی رد عمل ہی کسی وجہ سے غیر معمولی ہوتا ہے تو وہ بھی لکھنے والے کے دماغ پر اثر چھوڑ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ اگر سڑک کے کنارے بہت سے پیڑ اور پودے لگے ہیں اور ان پر پھول کھلے ہوئے ہیں تو افسانہ لکھنے والے دماغ کے لئے یہ کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ لیکن اگر اس موسم میں سارے پودوں اور درختوں پر پھول نہیں ہیں اور ایک درخت الہما ہے جس پر پتیاں نہیں، لیکن کسی ننھی ڈالی پر ایک سرخ ٹک کا بڑا سا پھول لٹک رہا ہے تو اُس پھول نے میرے دماغ کے جیسے تار تار جگادئے۔ چند باتیں چنانچہ فوراً دماغ یا ڈائری میں نوٹ کر کے جو گھر لوٹا تو دسمبر، نام کا افسانہ لکھ ڈالا۔

اگر آپ یہ پوچھیں کہ آیا کہانی لکھنے والوں اور دوسرے آدمیوں میں کوئی فرق ہوتا ہے تو میں زور دے کر کہوں گا، فرق ہے اور بہت بڑا فرق ہے۔ یعنی اُس سیمر کے پھول کو اگر میرے علاوہ کوئی اور دیکھتا تو اُسے سیمر کی رُوئی کا خیال آتا، اور پھر اُسے اپنا وہ تکیہ یاد آتا جس میں رُوئی اب دب کر بہت کم رہ گئی ہے۔ لیکن یہ ایک معمولی آدمی کے ذہنی ردِ عمل کی بات ہے، جو اس دُنیا کو اپنی ضروریات سے الگ رکھ کر سوچ ہی نہیں سکتا۔

لیکن فرض کیجئے کہ اس کے بجائے وہ آدمی کسی قدر Idealist یعنی تصوری ہے۔ مگر وہ بہت جذباتی یا تصویری ہو کر بھی سیمر کا پیٹر دیکھ کر زیادہ سے زیادہ ہی سوچے گا کہ سڑک کے کنارے ایسے درخت نہیں لگانے چاہئے جو اس موسم میں اس بُری طرح تنگے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ سڑکوں کے کنارے عموماً خوبصورت سرسبز اور شاداب پیٹر پودے ہونا چاہئے۔ اس کے بعد، چونکہ آدمی وہ تصویری ہے، اپنی دماغی دُنیا میں وہ سیمر کے پیٹر کو ایک پھول کے بجائے اُسے ہزاروں لاکھوں پھولوں سے لاددے گا تاکہ درخت

پھولوں سے لُد کر اچھا لگنے لگے۔ لیکن افسانہ نگار ہونے کے سبب سے میرا سر چونکہ زیادہ پھرا ہوا تھا اس لئے اُس رنگے میسر کے درخت میں میں نے اپنے پورے سماج کو دیکھا اور اس اکیلے سُرخ پھول کی سُرخ میں اُن گنت آدمیوں کا خون دیکھ کر ایک ترقی پسند ادیب بن بیٹھا۔ اور اگر میں ترقی پسند ادیب نہ ہوتا تو ایسا کچھ نہ سوچتا۔ بلکہ اُس پھول کو اپنے معشوق سے مشابہہ پا کر نشر کی زبان میں شاعری کرتا اور اس طرح آتما اور پر ماتما کو ملا کر ایک کہانی لکھ کر تیار کر دیتا۔

منشی پریم چند سے ایک بار ناول نگار پر بولنے کے لئے کہا گیا۔ چونکہ ہوسٹل میں اُس وقت میں بھی رہتا تھا۔ اس لئے اُن کی تقریر سننے کا موقع مجھے بھی ملا۔ لیکن منشی جی کی زبان سے جب میں نے یہ سُنا کہ ناول لکھنے والے کو ایک حد تک آوارہ یعنی Vagabond بھی ہونا چاہئے تو مجھے بہت تعجب ہوا اور میں نے سوچا کہ شاید منشی جی مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن آج جب پریم چند کی اُس بات کو سوچتا ہوں تو تعجب اس پر ہوتا ہے کہ آخر اُس آسانی سے کتنی بڑی بات کہہ گئے تھے وہ۔ دراصل ناول یا کہانی لکھنے کے لئے آدمی کی طبیعت میں

تھوڑی آوارگی نہایت ضروری ہے۔ ذہنی آوارگی تو آرٹ کے کسی بھی شعبہ میں کمال حاصل کرنے کے لئے، چاہے وہ شاعری ہو یا مصوری یا کوئی اور فن ہو، لازم ہے۔ لیکن ناول یا کہانی لکھنے والے کے لئے اس ذہنی آوارگی کے علاوہ خود اس کی زندگی میں آوارگی کا تجربہ ایک حد تک ضروری ہوتا ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ اگر یہ طبیعت اور ذہن کی آوارگی آدمی میں نہ ہو تو ایسی بے ڈھنگی اور غیر ضروری چیزوں سے وہ دلچسپی لے ہی کیوں۔ محنت اور ایمانداری یا غیر ایمانداری سے پیسہ کما کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنا ہی کیا کم ضروری کام تھے زندگی کے لئے؛ زمین پر رہتے ہوئے دو پتکھ باندھ کر انسانی زندگی کی حدود سے باہر اڑنا زمین کی زندگی کا میاب بنانے کے لئے ضروری نہیں۔ اور جو ایسا کرتا ہے وہ آوارہ نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے دنیا کی نظروں میں؛ لیکن جہاں دوسرے آرٹ کے لئے یہ ذہنی آوارگی ہی کافی ہو سکتی ہے، وہاں ناول اور کہانی کے لئے آوارگی زندگی میں بطور ذاتی تجربے کے ضروری ہوتی ہے۔

بہر حال خود اپنی کہانی سناتے ہوئے مجھے یہ بتانا ہے کہ

یہ شوق یا بدشوقی جوں جوں بڑھتی گئی میری ادبی سرگرمی بھی اُس کے ساتھ بڑھتی گئی۔ ایک کے بعد دوسری، کہانیوں پر کہانیاں میں نے لکھیں۔ لکھنے سے بھی زیادہ پڑھتا تھا۔ جتنا ہی زیادہ پڑھتا اتنا ہی اپنی لکھی ہوئی چیز پوتج، پڑ اور نامکمل لگتی۔ جتنا ہی لکھتا اتنا ہی لکھنے کی مشق بڑھتی تھی اور قلم میں طاقت اور روانی آتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر دس جملے لکھ کر پانچ جملے تک کاٹ دینے پڑتے تھے۔

بہر حال اس لکھنے اور پڑھنے کے سلسلے سے سمجھ میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ بلکہ ہر چیز اب ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی جیسے عادت سی ہو گئی۔ رہنا اسی دنیا میں پہلے ہی تھا۔ لیکن وہی دنیا اب جیسے مجھے بدلی بدلی سی لگنے لگی۔ دکھ سکھ پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں، لیکن پہلے اور اب سے دکھ سکھ میں جیسے بڑا فرق معلوم ہوتا ہے مجھے۔ کہانیوں میں دکھ سکھ کے نقشے کھینچتے کھینچتے اپنے دکھ سکھ کھلونوں جیسے لگنے لگے۔ کسی لکھنے والے کے لئے میں یہ سب سے بڑا اور ضروری تجربہ سمجھتا ہوں۔ چند ناول اور کہانیاں لکھ کر کچھ پیسے یا نام کما لینا ایک چیز ہے۔ لیکن اس لکھنے سے اگر لکھنے

وانے کی ذہنی اور روحانی ترقی ہوتی نظر نہیں آتی، جس طرح میں نے بیان کیا ہے، تو بہتر ہوگا اگر وہ لکھنے والا کا غزقلم پھیک کر کچھ اور نہیں تو گھاس ہی کھودے۔

سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ میں کیسے لکھتا ہوں بہت لوگ لکھنے سے پہلے افسانے کا ایک ڈھانچہ بنا لیتے ہیں اور پھر اسی ڈھانچہ کے سہارے لکھنا شروع کرتے ہیں۔ کچھ ایسے لکھنے والے بھی ہیں جو دیکھے یا سنے ہوئے واقعات کی بنا پر، جگہوں اور لوگوں کے نام بدل کر، کہانیاں تیار کر لیتے ہیں۔ میری عادت یہ نہیں، اور شاید اسی وجہ سے میرے افسانوں میں عموماً کوئی پلاٹ، نہیں ہوتا۔ میں عام طور سے جب کوئی چیز دیکھ کر بہت متاثر ہوتا ہوں تب ہی اس اثر کے ماتحت، کہانی لکھتا ہوں۔

مثال کے طور پر آپ کو اپنی ایک آپ بیتی سناؤں۔ دو تین سال کا واقعہ ہے۔ رات اندھیری تھی۔ میں کہیں سے نسل کر لوٹ رہا تھا۔ اس طرف سے ایک ٹھیلہ جا رہا تھا۔ چونکہ ٹھیلہ خالی تھا اس لئے صرف دو آدمی اسے پیچھے سے دھکا دیتے لئے جا رہے تھے۔ تیسرا آدمی ٹھیلہ پر، اپنا بدن

انگوچھے سے ڈھکے، اپنی گود میں ایک چراغ چھپائے ہوئے بیٹھا تھا۔ انگوچھا چراغ کو ہوا کے بھونکے سے بچاتا تھا۔ مزدور اپنی گود میں چراغ چھپائے اسی طرح چراغ کا سہارا بنا ہوا تھا جیسے کوئی چراغ دان یا ڈیوٹ چراغ کی حالتی ہوئی روشنی کا سہارا ہوتا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اس لئے کہ وہ ہوائی حملے کا زمانہ تھا۔ لیکن پھر بھی پولیس سے بچنے کے لئے ٹھیلہ پر بستی ضروری تھی۔ انگوچھا چراغ کے گرد ہوائی حملے سے بچاؤ، کا بھی کام کر رہا تھا۔

جب میں نے اُس پوری چیز پر غور کیا تو جیسے سرمایہ داری نظام کا پورا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ صرف مزدور کے ہاتھ میں چراغ جل رہا تھا۔ چنانچہ گھر لوٹ کر میں نے ایک کہانی لکھتی شروع کی، جس کا نام رکھا، بلیک آؤٹ، لڑائی ختم بھی ہو گئی لیکن میری وہ کہانی ختم نہ ہو سکی۔

جس طرح آدمی الگ الگ ڈھنگ اور طبیعت کے ہوتے ہیں اسی طرح اُن کے لکھنے کے ڈھنگ بھی الگ ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی ایک

طریقہ صحیح ہے اور بقیہ سب غلط ہیں۔ پھر بھی خود اپنے تجربوں کی بنا پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ لکھنے کے لئے پڑھنا ضروری ہے اور آدمی جتنا زیادہ لکھتا ہے اتنا اچھا لکھنے کا وہ امکان رکھتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ لکھا جائے اُسے چھپا ہی دیا جائے۔ روٹی کی مجبوری انسان سے جو نہ کرا لے، ورنہ میں خود کسی چیز کو بہت انتظار کر کے اور اُسے بار بار دوہرا کر اور صاف کر کے چھپاتے کا قائل ہوں۔

کچھ لوگ بہت کم عمر میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں میں نے خود شاید ۲۷ یا ۲۸ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ ایسی حالت میں کوئی بات زور دے کر میں نہیں کہہ سکتا۔ پھر بھی میرا ایسا خیال ہے کہ لکھنا جہاں تک ہو سکے کم عمر میں نہ شروع کرنا چاہئے۔ خاص طور سے کہانی اور ناول کے لئے دلدادہ دماغ اور تجربہ کی پختگی کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

جس طرح اینٹ آگ میں پکتی ہے اُس طرح آدمی جب زندگی کی آگ میں سال بہ سال پختا ہے تب اُس کی آنکھوں اور دماغ میں وہ روشنی آتی ہے جو اُس کو چیزوں اور آدمیوں کو دیکھنے اور پہچاننے کی وہ قوت دیتی ہے جس کی



# دعوتِ نظر

اویناش نے آج زبان تو کھولی لیکن دل کھولتے وقت سنکوج کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی اندرونی شرم سے اُس کی آنکھیں جھکی جاتی تھیں۔ اُسے میں نے زیادہ ہنستے بولتے تو کبھی بھی نہ پایا تھا۔ لیکن اُسے اتنا سنجیدہ اور غلگین بھی شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہو۔

اویناش جب چُپ رہا تو مجھے چُپ رہنا ہی تھا۔ لیکن میں نے جب دیکھا کہ اپنے سے وہ اور کچھ ہرگز نہ کہے گا تو میں نے ہی اُس سے پوچھا۔ ”تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہاری اُس سے ملاقات کیسے ہوئی؟“

اُس نے آنکھیں اوپر کر کے میری طرف دیکھا اور پھر سر نیچا کر لیا۔ آہستہ آہستہ اپنی بات وہ کتنا جا رہا تھا اور میں سنتا جاتا تھا۔ مجھ پر پورے ماحول کا جادو جیسا اثر ہو رہا تھا۔

سمجھتا تھا جیسے میرے ہی اندر بے کوئی بول رہا ہے کبھی یہ کبھی شبہہ ہوتا کہ آواز کہیں اوپر سے آ رہی ہے۔

ہولی کی چھٹیوں میں عام طور سے میں گھر نہیں جاتا تھا۔ ہوسٹل میں رہ کر بھی میں لڑکوں کے ساتھ ہولی وغیرہ نہیں کھیلتا تھا۔ ہولی کے دن ہوسٹل اور کالج کی دنیا سے دور جا کر میں آزاد پارک میں اُس سرو کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتا، جو ۵۰ سالہ میں مرے ہوئے گورے سپاہی کی مزار پر آج بھی رکھوالی کر رہا ہے۔ ہاتھ میں کوئی کتاب لے اُس سرو اور دوسرے درختوں کے سایہ میں بیٹھا بیٹھا اس طرح ہولی کا دن گزار دیتا۔ ہوسٹل شام کو اسی وقت لوٹتا جب ہولی کا میلہ ختم ہو گیا ہوتا۔

محض اتفاق تھا جو پچھلے سال ہولی کے موقع پر گھر میں گیا۔ اور یہ بھی صرف اتفاق ہی کا کھیل تھا جو اُس وقت وہ میرے وہاں موجود تھی۔

والد اُس کے زمیندار تھے۔ مگر دیہات میں رہتے ہوئے بھی اُنھوں نے گھر پر پڑھا کر اُسے مڈل تک کی ہندی اور اُردو کی قابلیت کرا دی تھی۔ لیکن چونکہ اب اُس کی عمر ایسی

تھی کہ شادی کا سوال جلد ہی پیدا ہوتا اس لیے ماں نے سوچا شادی سے پہلے اگر لڑکی کچھ دنوں شہر میں رہ کر شہری زندگی کے رُوپ رنگ سے بھی واقف ہو جائے تو کیا اچھا ہو۔ ویسے اُس سے پہلے وہ شہر اُتر آئی گئی تھی۔ لیکن اب چونکہ شادی کا سوال تھا اس لیے سلمانی وغیرہ سیکھنے کے خیال سے اُس کے گھر والوں نے خاص طور سے کچھ دنوں کے لیے میرے بھائی صاحب کے وہاں بھیجا، جو اُس کی ماں کی وجہ سے سسرال کے ناتے سے بہت نزدیک کے رشتہ دار ہوتے تھے۔

وہ دیہات میں رہتی ضرور تھی۔ لیکن اُسے کسی صورت سے دیہاتی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ بلکہ میں نے تو یہ دیکھا کہ دیہات میں رہتے ہوئے شہری زندگی کا احساس جتنا اُسے تھا اتنا کہ میں رہنے والی لڑکیاں اپنی شہری زندگی سے متاثر نہیں تھیں۔ پہننے اڑھنے میں وہ جس احتیاط اور ارادی نفاست سے کام لیتی تھی اُس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا اُسے بہت خیال رہتا تھا کہ شہر میں رہ کر شاید ان مصنوعی پہلوؤں پر خاص دھیان دینا چاہیے۔ رنگ اُس کا گورا تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لیکن اُس کے گالوں کی ہلکی گلابی کا اثر چہرے پر ایسا پڑتا تھا کہ دیکھ کر اُسے کوئی

سانو لاجھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ خاص طور سے اُس کا ہنسناسب کو اچھا لگتا تھا، کیونکہ ہنسنے وقت اُس کی آنکھیں بھی جیسے مسکراتی تھیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ بڑی بڑی چینل چکور جیسی اُس کی آنکھیں ویسے ہی ناچا اور مسکرایا کرتی تھیں جیسے وہ خود جہاں رہتی ناچتی اور مسکراتی پھرتی تھی۔

معلوم نہیں کیوں شروع ہی سے وہ مجھ سے دلچسپی رکھنے لگی۔

میں نے سوچا کہ شاید ایک دو دن بعد جب اوروں کی طرح وہ بھی مجھ سے مانوس ہو جائے گی تو میرے واسطے اُس کا استعجاب آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ پیٹھ پیچھے گھر کی دوسری لڑکیوں سے میری تعریف کرنا جیسے اُس کی عادت سی ہو گئی تھی تو مجھے بھی تشویش ہونے لگی۔ جہاں تک میرا سوال تھا، میں یوں بھی لڑکیوں سے بہت گھبراتا تھا۔ لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ مجھ پر خاص طور سے مہربان ہے تب تو اُس کے سامنے آنکھیں اٹھائے نہ اٹھیں۔ جب میں اوروں کے ساتھ بیٹھا رہوں اور وہ بھی اُس وقت وہاں آجائے تو میں ایسا محسوس کروں کہ جیسے شرم کے مارے میں زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔ لیکن میرے لئے جو پریشانی کی چیز تھی وہ یہ کہ میرے

منہ سے کوئی بات نکلی نہیں کہ وہ اُسے پوری کر دیتی تھی۔ اور اگر میں جلدی میں بات پوری بھی کہہ جاؤں تو اُس کی تائید کرتا یا ہاں میں ہاں ملانا جیسے اُس کی دوسری ڈیوٹی، تھی۔ گھر کی دوسری لڑکیاں اُس کی ان حرکتوں کی وجہ سے میرا اور اُس کا دونوں کا مذاق اڑاتیں۔ میں ایسا محسوس کروں کہ پوری پوچھا میرے ہی اوپر ہے۔ میری گھبراہٹ اور پریشانی قدرتی طور پر کسی قدر لازمی تھی۔ اس وجہ سے کہ اُس کی ان حرکتوں سے میں ایسا محسوس کروں کہ گھر والے شاید یہ سوچتے ہوں کہ اُس کے اُلٹھڑپن اور شوخی کا کارن میں ہی تھا۔ لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اُس کی ساری ہمدردی اور بیباکی کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے نہایت ہی سیدھا سادا اور شرمیلا انسان سمجھتی تھی تو اپنے بارے میں اُس کی اُس تشخیص کو سن کر اور پشیمان ہوا، اور اندر ہی اندر سخت گڑھن ہوئی۔ میں خود لنگڑایا اندھا ہوں اور دوسرا کوئی میرے لئے اندھے کی لالٹھی بننا چاہتا ہے، یہ احساس کسے اچھا لگتا۔ کون نہیں چاہے گا کہ کوئی اُس کی خوبیوں کو چاہے۔ لیکن سیدھا یا بدھون کر کسی کی ہمدردی کا محتاج بننا کون پسند کرے گا۔ چنانچہ اس طرح میں اُس کے اور دوسروں کے

لئے تماشہ بن کر رہ گیا۔ اور جلد ہی مجھے پوری چیز سے کوفت اور پریشانی ہونے لگی۔

بہر حال ابھی مشکل سے دو یا ڈھائی دن گھر پر رہا تھا کہ ایک دوپہر کو وہ میرے کمرہ میں چلی آئی۔ میں یونہی چارپائی پر پڑا سوچ رہا تھا۔ اُدھر جب دھیان گیا تو دیکھا وہ سر ہانے کھڑی ہے۔ جیسی اُس کی عادت تھی، کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے تو با مجھے سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ اُس کی نگاہوں کی مار سے بچوں تب تو کوئی صورت نکالوں لیکن وہ کاہے کو مانتی۔ مستقل کھڑی مُسکراتی رہی۔ مگر میں اُس بیچارگی کی حالت میں آخر کب تک پڑا رہتا۔ چنانچہ جب میری آنکھیں بھی اُلٹ کر اسی کو دیکھنے لگیں تو اُس کی نگاہیں مروت یا حیا سے بچی ہو گئیں۔ جب میں سینھل کر پلنگ پر اُٹھ بیٹھا تو دیکھا اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب اور کاپی بھی ہے۔ اب تو اُس حالت میں اُس کا وہاں ہونا میرے واسطے ایک نہ حل ہونے والی پہیلی ہو گئی۔ مارے پریشانی اور گھبراہٹ کے میں لال ہو جا رہا تھا۔ بدن اندر ہی اندر ایسا کانپ رہا تھا کہ جیسے جوڑی آنے

والی ہو۔ لیکن جب اس طرح اُس نے جی بھر کے مجھے ذلیل کر لیا تو خود ہی مسکرا کر پلنگ کی پٹی پر مجھ سے ذرا دور بیٹھا، بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کو تو میرے پاس پلنگ پر بیٹھی تھی۔ لیکن پاس بیٹھ کر بھی مجھ سے جو دوری نبھا رہی تھی اُس سے مجھے اور خلس ہونے لگی۔ آخر میں ذات کے باہر تو تھا نہیں جو مجھ سے ایسا برتاؤ کیا جاتا۔ گھر میں دوسری لڑکیاں بھی تو تھیں۔ لیکن میرے پاس بیٹھ کر اور تو کو کوئی اس طرح ذلیل مجھے نہیں کرتا تھا۔

لیکن ابھی کیا۔ اصل کہانی اب شروع ہونے کو تھی۔ معلوم ہوا کہ اُسکی مرضی سے یا گھر میں کسی اور کے کہنے سے میں اُس کا انگریزی کا ماسٹر چنا گیا تھا۔ چنانچہ یہ معلوم کرتے ہی مجھے تو وہ ساری کہانیاں یاد آنے لگیں جو شروع ہوتی ہیں کسی یتیم لڑکے سے اور ختم ہوتی ہیں کسی امیر گھر کی لڑکی سے شادی ہو کر، جس کو پڑھانے کے لئے اصل میں وہ ماسٹر رکھا گیا تھا۔

اُس کا پڑھانا تو د میرے لئے ایک بڑا امتحان تھا۔ ویسے کہاں کا ماسٹر تھا جو میں کسی کو بھی پڑھا سکتا۔ پھر

رومن، حروف میں لفافوں پر پتہ لکھنے والی شباب کی  
 سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی سن رسیدہ لڑکی کو انگریزی  
 پڑھانا کسی کے لئے بھی کیا آسان کام ہو سکتا تھا۔  
 چنانچہ جب وہ بڑی بڑی شوخ آنکھیں اٹھا کر کسی لفظ کا  
 مطلب پوچھتی تو میری آنکھیں ایسی لڑکھڑائیں کہ سنبھالتے  
 سنبھالتے بھی میں کہاں سے کہاں جا کر گرتا۔ پھر میں سوچتا،  
 خاک میں ملے ایسی پڑھائی جو ہر منٹ مجھے ہی اس طرح  
 فیل پاس کئے دیتی ہے۔ اور جب اپنی نرم کوئل اٹنگلی کسی  
 لفظ پر رکھ کر وہ پڑھنے کی کوشش کرتی تو ہلکا کر میرا  
 ہی تلفظ گڑبڑا جاتا، اُس کا تلفظ کہاں سے درست کرتا۔  
 بہر حال وہ پڑھائی لکھائی کا سلسلہ کچھ زیادہ کامیاب  
 نہ ثابت ہوا۔ وہ گھر میں جا کر رپورٹ کرتی۔ معلوم نہیں بھائی  
 صاحب کیوں کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ پھر میری  
 سیدھائی اور اس لئے اچھائی کی تعریفیں کرنے لگتی۔  
 چنانچہ جب ایک دن ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر اندر کی یہ  
 داستان میں نے سنی تو سوچا خیریت اسی میں ہے کہ اب  
 یہاں سے بھاگ چلو۔ ورنہ یہ ماسٹری تو مٹا کر ہی چھوڑنی۔

یونیورسٹی میں چونکہ اور درجوں کے امتحان ہو رہے تھے اس لئے  
 ہولی کی چھٹی ختم ہو جانے کے باوجود بھی گھر پر ٹھہر گیا تھا۔  
 سوچا وہاں بھی جا کر ایسی پڑھائی لکھائی تو ہوگی نہیں،  
 اس لئے بہتر ہوگا ایک ہفتہ گھر پر ہی رہ کر پڑھوں۔ لیکن  
 پڑھائی کہاں سے ہوتی، یہاں تو ماسٹری ہو رہی تھی۔ اس  
 لئے طے کیا کہ اب یہاں سے چلوں۔

گھر والوں کو دوسرے ہی دن اس کی اطلاع دے  
 دی۔ اس کا اثر اُس پر عجیب ہوا۔ پہلے تو کچھ اُداس سی نظر  
 آئی۔ پھر جو میری خدمت پر اتر آئی تو دوسرے میرے  
 نزدیک پھٹکنے بھی نہ پائیں۔ اندر پہنچا نہیں کہ میرا کھانا  
 نکالنے رسوئی میں پہنچ گئی۔ ایک دن ایسے ہی جب میں  
 چوکے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو وہ سٹی سے پوتی ہوئی  
 گیلی نرم زمین پر چھجے سے کچھ لکھنے لگی۔ لیکن جوں ہی میں  
 نے اُس طرف دیکھنے کو آنکھیں اٹھائیں اُس نے چھجے سے  
 عبارت مٹادی۔ بس اتنا دیکھ پایا کہ میرے نام کا پہلا  
 حصہ ابھی لکھا جاسکا تھا کہ اُسے فوراً اُسی چھجے سے کرید کر  
 صاف کر دیا گیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ تصور اچھا لگا کہ وہ

بیٹھی بیٹھی میرا نام لکھا کرتی ہے۔ لیکن جو چیز اچھی نہیں لگی وہ اُس کا اس سہولت سے میرا نام مٹانا تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اُس طرح اپنا نام و نشان مٹنے کا قلق اور دکھ بہت دنوں تک رہتا اگر اُسی دن شام کو برآمدہ میں سے گزرتے وقت اتفاق سے میں نے غسل خانہ میں اُس کا گنگنا نا نہ سُن لیا ہوتا ہے

کھیل اُس کسین نے کھیلنا نام لے لیکر میرا

ہاتھ سے تربت بنائی پیر سے بر باد کئی

تب میں نے سمجھا کہ وہ کسین کا کھیل تھا اور وہ میری تربت تھی جو بنا کر اس طرح بر باد کی جا رہی تھی۔ اور وہ بھی اُس کے لئے کھیل ہی تھا جو اُس دن دوپہر کو، جب میں کھانا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹا تھا، وہ دو بیڑے پان لے کر آئی اور اُنھیں اچانک میرے منہ میں رکھ دیا۔ میں نے بیڑوں کو دانتوں تلے دبائے نہیں کہہ سکتے ہوئے پان گھسیٹ لے گئی۔ جس وقت میں بچے ہوئے بیڑوں کو منہ میں زبان سے سنبھال رہا تھا تو وہ کٹے ہوئے پانوں کو اپنے منہ میں ڈالتی ہوئی منس کر کے

باہر نکل گئی۔

اپنی بات کہہ کر اونیاش چپ ہو گیا۔ مجھ سے بھی اب کچھ بولتے نہ بے بند کمرہ میں صرف خاموشی کی لہریں تیر رہی تھیں۔ اونیاش کی آنکھیں اب بھی نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ میں حیرت کر رہا تھا، میں نے اونیاش کو کیا سمجھ رکھا تھا اور دراصل وہ کیا نکلا۔ اُسے اس نئی روشنی میں دیکھ کر میں ہی سوچ رہا تھا کہ آدمی کی زندگی کے بھی کیا کیا پہلو ہوتے ہیں۔ میں نے اُسے کیا سمجھا تھا اور کیا پایا۔ یہ سوچتے سوچتے جیسے میری شخصیت گھٹی جا رہی تھی اور کمرہ کی خاموش فضا میں چھوٹی ہو کر جیسے کھوئی جا رہی تھی۔ جب اونیاش اپنی کہانی سنا رہا تھا تو میں اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا کہ کیا وہ سب سچ تھا جو وہ سنا رہا تھا۔ اور جب وہ کہانی ختم ہو چکی تھی تو میں بیٹھا تعجب کر رہا تھا کہ اونیاش اپنے دل پر اتنا بڑا بوجھ کیسے لئے پھرتا ہے۔ پھر خاموشی سے چونک کر میں نے پوچھا۔

”تب کیا ہوا؟“

آنکھیں فرش پر گڑائے ہوئے اُس نے جواب دیا۔ رات کی گاڑی سے میں آنے والا تھا۔ چلنے سے پہلے ایک لمحہ

کے لئے وہ میرے پاس آئی تھی۔ اُس نے کہا۔ 'آپ جارہے ہیں؟' میں نے کہا۔ 'ہاں۔ چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے جیسے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو، اُس نے پوچھا۔ 'پھر کب؟' میرے منہ سے لفظ 'شاید' سننے سے پہلے وہ ایک دم جل دی اور انچل سے منہ پونچھتے پونچھتے کمرہ کے باہر نکل گئی۔

میں پتھر کی مورت کی طرح بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کون کسناں رہتا ہے! کون کس کا ہوتا ہے!! او نیاش کی ڈکھ بھری کہانی سننے سننے میرا جی بھر آیا۔ لیکن اُس کے سنجیدہ مزاج کو جانتے ہوئے میں نے مناسب نہ سمجھا کہ درد کی اُس کیفیت کو اُس کے اوپر دیر تک قائم رہنے دیا جائے۔ چنانچہ اُس کا جی ہلکا کرنے کے لئے میں ہنسنے لگا۔ جیسی اُس کی عادت تھی، جھینب کر وہ بھی ہنسنے لگا۔ لیکن میں چونکہ اُس کی طبیعت سے واقف تھا اس لئے میں نے سوچا کہ وہ اتنا جلد اُس اثر سے نہیں چھوٹ سکے گا۔ چنانچہ اُس کی طبیعت بہلانے کے لئے میں نے کہا۔ 'ان باتوں میں کیا رکھا ہے یار۔ ایسا تو سب ہی

کے ساتھ کبھی نہ کبھی ہوتا ہے۔ میں تو آدمی کی زندگی کے لئے  
یہ بھی ایک ضروری کھیل سمجھتا ہوں۔ بالکل ایسا ہی میرے  
ساتھ بھی ایک واقعہ گزرا تھا۔ تم سونگے تو تم بھی کہو گے  
کہ ہاں۔

جاڑوں میں بڑے دن کی چھٹیاں شروع ہوئی تھیں۔  
میں گھر جا رہا تھا۔ وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچ گیا۔ انٹرکلاس  
میں ایک طرف بستر لگا کر لیٹ رہا۔ سامنے والی برتھ پر  
ایک مارواڑی اپنا بستر لگائے تھا۔ اتنے میں ایک بھلے  
آدمی بال بچوں کے ساتھ ڈبے میں داخل ہوئے۔ دونوں  
دروازوں کے بیچ میں جو برتھ تھی وہی خالی تھی چنانچہ  
وہ اور اُن کی بیوی، جو دیکھنے میں اُن سے عمر میں بڑی  
لگتی تھیں، اُسی برتھ پر قابض ہو گئے۔ سامان اندر آنے  
کے بعد سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی بھی چھوٹی بہن کو  
انگلی پکڑائے اندر آئی۔ اُن دونوں کے علاوہ ماں کی  
گود میں بھی ایک بچہ تھا۔ لیکن مسافروں سے بھی زیادہ  
اُن کا سامان تھا، جسے قیلوں نے دیکھتے دیکھتے ڈبے میں  
نیچے اوپر بھر کر جیسے ڈبہ کو سجا دیا۔ جب سامان رکھا جا چکا تو

بیٹھنے کا سوال پیدا ہوا۔ میاں بیوی اسی دہر تھ، پر بیٹھ گئے، اور اُن کے ساتھ اُن کی بڑی لڑکی بھی۔ چھوٹی لڑکی جس کی عمر شاید چھ سات سال رہی ہوگی، بیچ میں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس لئے میں نے اُسے اپنے پیر کے پاس جو جگہ خالی تھی اُس پر بیٹھ جانے کو اشارہ کیا۔ یوں شاید وہ میرے پاس نہ بیٹھی کیونکہ میرے کہنے کے باوجود بھی ہچکچا رہی تھی۔ لیکن اسی وقت بڑی بہن کا اشارہ پا کر وہ میرے پیر کے پاس پھاٹک سے ڈبک کر بیٹھ گئی۔ ابھی اُن لوگوں کا بستر وغیرہ لگ ہی رہا تھا کہ گاڑی چلنے لگی۔

ٹرین کے سفر کے مزے اسی کو ملتے ہیں جس کو کم سے کم لیٹے کی جگہ نصیب ہو۔ چنانچہ اسی میری سفر میں ماڈرن ہے، میں نے سگریٹ جلائی، ڈبہ سرمانے رکھی اور ٹیکہ کے نیچے سے ناول نکال کر پڑھنے لگا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ بالکل پڑھنا ہی رہا کیونکہ اگر صرف پڑھنے ہی میں لگ گیا ہوتا تو یہ کیسے بتا سکتا کہ ڈبہ میں اور کیا کیا ہو رہا تھا۔ ایسے ماحول میں پڑھنے پاتا بھی کیسے، جہاں علاوہ اور

خلل اور ہنگاموں کے ان پڑھ مارواڑی کی مستقل بلکواس مارے ڈال رہی تھی۔ لیکن جب ہاتھ میں کتاب لے کر پڑھنا شروع کر دیا تھا تو پھر اُسے کس بہانے اٹھا کر رکھ دیتا۔ چنانچہ نہ پڑھتے ہوئے بھی اُسے کسی طرح پڑھنا یا یہ توجہ بالکل کتاب اٹھا کر ڈال ہی دیا تب معلوم ہوا کہ اُس کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ کوئی اور بھی پڑھ رہا تھا۔ اور کجخت مارواڑی اُس وقت اُس بھلے آدمی سے یہاں تک پوچھ چکا تھا کہ لڑکی کس درجہ میں پڑھتی ہے، چھوٹی لڑکی نے ابھی پڑھنا شروع کیا یا نہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اُس کے لئے اتنا کافی نہ تھا کہ وہ کون تھے، کہاں رہتے تھے، اور کہاں جا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ جاہل، بھسے خود پڑھائی لکھائی سے دُور کا واسطہ بھی نہیں، سب کی پڑھائی ہی کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے۔ میری پڑھائی لکھائی تو مجھے اس کی اجازت دیتی نہ تھی کہ اس طرح انجان آدمیوں کی بات چیت میں حصہ لینے لگتا۔ بلکہ بغیر جان پہچان کے لوگوں سے بات چیت کرنے کو میں صرف حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مگر میری پریشانی کا پارہ سب سے زیادہ

اونچائی پر اُس وقت پہنچا جب میں نے سنا کہ مارواڑی باتوں کے سلسلہ میں یہ بھی بے مانگی رائے دیئے دے رہا تھا کہ حج صاحب کو بہت جلد اپنی لڑکی کی شادی کے مسئلہ کو بھی حل کرنا پڑے گا۔ اُس وقت جو میں نے نظریں بچا کر جھانک کر دیکھا تو شادی ہونے والی کا پورا چہرہ ہندی رسالہ کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

مارواڑی کی زبان سے لڑکی کی شادی کا ذکر سن کر تو جیسے میں اپنی ساری خوشی ہی کھو بیٹھا۔ لڑکی کو بھی وہ باتیں کیا پسند آتیں۔ چنانچہ اُس نے شاید شرم کی وجہ سے اپنا منہ کھڑکی کے باہر کر لیا۔ مجھ سے بھی چونکہ مارواڑی کی باتیں نہ سنتی جا رہی تھیں اس لئے میں بھی اپنی گردن نکال کر باہر دیکھنے لگا۔ وہ کام اچھا نہیں ہوا تھا اس کا احساس تو لڑکی کی نظر سے نظر مل کر ہوا۔ لیکن گاڑی میں ہم دونوں ایک ہی طرف بیٹھے تھے اس لئے کرتے بھی تو کیا کرتے۔ جب بھی ڈبہ کے باہر سر نکالتے تو نگاہوں کے ملنے کے خطرہ کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن پھر بھی اُس وقت رنگاں ایک ہو جانے کے بعد تو گھبراہٹ میں سر اندر کر ہی لینا پڑا۔

لیکن لڑکی کی آنکھوں سے بچنے کے لئے جو سُر اندر گیا تو مارواڑی کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہو گئیں۔ مگر جھنجھلاہٹ میں جو اُس کی طرف سے منہ موڑنا چاہا تو میری تو جیسے شامت ہی آگئی۔ چنانچہ جب اُس نے مجھ سے پوچھا۔ ”بابو جی، آپ کیا کرتے ہیں؟“ تو مجھے اتنا بُرا لگا کہ میں اُس کے سوال کا جواب بھی نہ دیتا اگر اسی وقت میری جج صاحب اور اُن کی بی بی کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ مجبوراً عدالت میں ملازم کی طرح پھر میں نے سب کچھ بتا دیا۔

اُس کے بعد مارواڑی نے بیڑی جلا کر میرے اور میرے خاندان اور گھر کے بارے میں جو جرح شروع کی وہ تو مجھے تنگ کر کے ہی چھورتی۔ اگر اسی وقت یہ جان کر کہ میں ایک بھلے کا کُستہ گھر کا لڑکا تھا اور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا پڑھے لکھے روشن خیال جج صاحب نے میری جان نہ بچائی ہوتی۔ میری پریشانی کو بھانپتے ہوئے اُنھوں نے بات ایسی بدل دی کہ بات کسی طرح اُس وقت ٹل ہی گئی۔ لیکن مارواڑی بھی کوئی ایسا ویسا آدمی تو تھا نہیں۔

چنانچہ وہ بھی اپنا آخری دانوں چل کر ہی مانا۔ اُس نے جب حج صاحب کے کنبہ کی دلچسپی مجھ میں بڑھتی دیکھی تو آنکھیں گھوما کر ایک ہی نظر سے مجھے، حج صاحب، اُن کی بی بی اور اُس لڑکی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا ”تو آپ لوگ تو ایک ہی ہیں۔“ حج صاحب تعلیم اور تہذیب کے آدمی تھے۔ ورنہ مار واڑی نے تو ہماری اور اُس کی شادی بھی وہیں اُسی ڈبہ میں کرادی ہوتی۔

اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی بچاری اب مجھ سے ضرورت سے زیادہ شرمانے لگی۔ لیکن یہ معلوم کر کے کہ میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا حج صاحب اپنی پڑھائی کے زمانے کی یاد تازہ کرنے لگے۔ پڑھنے لکھنے اور کالج یونیورسٹی کی بات چھڑ جانے سے مار واڑی کی زبان پر جیسے تالے پڑ گئے۔ چنانچہ کچھ دیر بعد وہ سیر شام ہی کسبل سے منہ ڈھاک کر سو رہا۔ ادھر ہم لوگ اچھی خاصی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ حج صاحب کی بی بی بھی شوہر کی پڑھائی کے دنوں کی داستان سن کر سن ہی من خوش ہو رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ سے کھسکتا کھسکتا اُن اُن لوگوں کے بہت نزدیک پہنچ گیا تھا۔ باتیں ہم لوگ ایسے

کر رہے تھے کہ جیسے پُرانے ملاقاتی ہوں۔ اس درمیان میں مارواڑی کے خاموش ہو جانے کے بعد اب اُس کی ناک اپنا کام شروع کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔

ہم لوگ دیر تک ہنستے اور باتیں کرتے رہے۔ اور اگر باتیں نہ کرتے تو کیا کرتے۔ ڈبہ میں اتنی جگہ تو تھی نہیں کہ مارواڑی کی طرح جج صاحب کے گھر والے بھی شام ہی سے پڑ کر سو رہتے۔ اور اُن کے جاگتے ہوئے مجھے کیسے پیند آتی۔ جلد نیند آنے کی جن کی عمر تھی وہ تو سو ہی گئے تھے۔ جج صاحب کے دونوں چھوٹے بچے اور ڈھلتی ہوئی عمر کا مارواڑی۔ لیکن اُس ظالم نے سو کر اور مر کر بھی ہم لوگوں کو چین نہ لینے دیا۔ اُس کی ناک کی آواز اب دھیرے دھیرے پورے ڈبہ میں گونجنے لگی تھی۔ لڑکی جب ناک کی آواز سنتی تو مجھے دیکھ کر اپنا مسکرا ماروکنے لگتی میں شرمندہ ہو کر جج صاحب کی طرف دیکھتا ہوا ہنس دیتا۔ لیکن معلوم نہیں اُس لڑکی کو کیا مذاق سوچا تھا جو اُس نے اس درمیان میں مارواڑی کی ناک کی آواز اور میرے درمیان ایک عجیب پُر مذاق تعلق قائم کر لیا تھا۔ ظاہر ہے مجھے اُس حرکت

سے اب گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ اور کچھ دیر بعد جب میں نے یہ دیکھا کہ مارواڑی کی ناک بولے یا نہ بولے وہ نظریں بچا کر میری طرف ضرور دیکھ لیتی تھی تو میری پریشانی اور بڑھی۔ کس پارٹی بڑی آنکھیں تھیں اُس کی۔ اب تو میں اُن آنکھوں اور بیچ صاحب دونوں ہی سے ڈرنے لگا تھا۔

اویناش چپ باتیں سن رہا تھا۔

معلوم نہیں میری پریشانی دیکھ کر یا کچھ اور سوچ کر بیچ صاحب بولے۔ ”بی بی کو نیند آ رہی ہوگی۔ اب کھانا کھا لینا چاہئے۔“ بی بی نے فوراً اُن کے خیال کی تائید کیا۔ ”جی ہاں“ میں کہنے ہی والی تھی۔ دیر ہو رہی ہے آپ کسے لئے۔ اتنا کہہ کر وہ اُٹھیں اور بیچے سے ڈوٹھی گھمسنے لگیں جس میں ناشتہ دان رکھا تھا۔ اُس کام میں لڑکی نے بڑھ کر اُن کا ہاتھ بٹھایا۔

کھانے پینے کا سامان ہوتے دیکھ کر بیچ صاحب نے مجھے متوجہ کر کے پوچھا۔ ”کیوں صاحب، آپ نے بھی تو ابھی کھانا نہیں کھایا؟ باتوں ہی میں رہ گئے۔“ میں چونکہ اُس سوال کے لئے تیار نہ تھا اس لئے گھبراہٹ میں سگریٹ جلاتے

ہوئے جواب دیا۔ ”جی نہیں، شکر یہ۔ رات میں کھانے کی میری عادت نہیں۔“ میری طرح بیچ صاحب تو کوئی بوکھلائے تھے نہیں۔ چنانچہ شاید لفظ ”شکر یہ“ پر مسکراتے ہوئے اٹھوں نے میری بات پکڑ لی۔ ”یہ تو آپ نے عجیب ہی بات بتائی۔ تو کیا رات کو آپ کھانا کھاتے ہی نہیں؟“ اُس وقت اُن کی لڑکی اُن بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے کھانے کی جیسے دعوت دے رہی تھی۔ میں نے شرمندہ ہو کر جواب دیا۔ ”جی نہیں میرا مطلب سفر سے تھا۔“

جو جملہ پورا نہ ہو سکا تھا اُسے کوئی اہمیت کیا دیتا چنانچہ دیکھتے دیکھتے ناشتہ دان کا ڈھکن دوپراٹھے اور کئی ترکاریاں رکھ کر میرے سامنے بڑھا دیا گیا۔ میں کھا رہا تھا اور سوتج رہا تھا کہ اتنے میں گلاس کا پانی اٹھانے کے لیے وہ آگے بڑھی۔ میں نے چاہا کہ لپک کر گلاس خود اٹھا لوں۔ یہ تو میرا اُس کا ماتھا چھو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ گلاس میرے علاوہ کسی اور کے لئے بھی اٹھایا جاسکتا تھا۔ لیکن جب گلاس کا پانی چھلک گیا تھا تو گلاس مجھ کو اُسے دینا ہی تھا۔ شاید ہم دونوں کے چہروں کو سُرخ

ہوتے دیکھ کر نوج صاحب نے پراٹھے کا ٹکڑا اچباتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے فرمایا۔ ”کوئی حرج نہیں۔ آپ کی بہن ہے۔“ میں گلاس کا پانی پیتے وقت پانی پانی ہو رہا تھا اور نوج صاحب کے جملہ کو سوچ رہا تھا۔ ”آپ کی بہن ہے۔“

ہاتھ منہ دھو کر بیٹھے تھے۔ نوج صاحب کی بی بی سامنے پاندان پھیلائے پان بنا رہی تھیں۔ انھوں نے پان بنا کر دو بیڑے نوج صاحب کو دیئے اور کچھ پان بیچ کی انگلیوں میں دبا کر دو بیڑے مجھے دینے کو لڑکی کو دیئے، اس لئے کہ وہ میرے قریب بیٹھی تھی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا، سامنے بکس پر پیر پھیلائے سگریٹ کا گول گول دھواں منہ سے نکالتے ہوئے اوپر روشنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس لئے پوری صورت جب سمجھ میں آئی جب لڑکی کو سامنے ہاتھ میں پان کے بیڑے لئے کھڑے دیکھ کر میں چونک پڑا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی اور میری آنکھیں اس بُری طرح ایک دوسرے سے اچھ گئیں کہ ان نگاہوں سے رہائی مشکل ہو گئی۔ نوج صاحب اور ان کی بی بی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے وہ کھڑی میری پریشانی پر مسکرا رہی تھی۔ میں نے جھٹ ایک طرف سے سر نکال کر

نج صاحب سے پان نہ کھانے کی اپنی مجبوری عرض کی۔  
 لیکن موقع پانے پر وہ کہاں چھوڑتے۔ "واہ صاحب، آپ تو  
 اچھے لے۔ سگریٹ پیتے ہیں اور پان نہیں کھاتے؟" کہہ کر وہ  
 ہنسنے لگے۔ بی بی انکی حاضر بیانی پر مسکرا رہی تھیں اور وہ لڑکی  
 شاید میری حماقت پر ہنس رہی تھی۔ لیکن میں اپنے قول پر  
 اڑا رہا۔ اس لئے اُس نے پان لے جا کر نج صاحب کی بی بی  
 کو دیدئے۔ لیکن اُن کا منہ تو آپ ہی بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ  
 پان دان بند کر کے منہ کا پان سنبھالتے ہوئے اُنھوں نے بہت  
 مشکل سے کہا لے جاؤ تم کھا ڈالو۔ میں لیٹا ہوا اپنی کہنختی  
 پر کڑھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ سے پان پھر کہاں ملیں گے۔  
 باوجود ہر مجبوری کے کھانے کے بعد سونا پڑتا ہے۔ چنانچہ  
 جگہ نہ ہونے پر بھی گود میں بچہ لئے نج صاحب کی بی بی اپنی جگہ  
 پر پیر سمیٹ کر پڑ رہی تھیں۔ نج صاحب اُن کے سر ہانے  
 ڈبہ کی دیوار سے لہر لگائے آنکھیں بند کئے تھے۔ میرے برتھ،  
 پڑ میرے پیر کے پاس چھوٹی لڑکی پر پھیلا کر سو گئی تھی۔  
 جہاں میری برتھ، ختم ہوتی تھی وہیں نج صاحب کی بی بی  
 کے پیر کے پاس دیوار سے کمر لگائے بڑی لڑکی بیٹھی کوئی

رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میں اپنی پڑھائی لکھائی ختم کیے اپنی جگہ پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ بہر حال بارہ بجے رات کے بعد میرے اور اُس کے علاوہ اُس وقت ڈبے میں سب ہی سو رہے تھے۔

سونا میں بھی جا ہتا تھا۔ اتنی رات کو کون نہ سونا جا ہتا۔ لیکن میری مشکل یہ تھی کہ اُسی ڈبے میں جب وہ دونوں بڑی بڑی آنکھیں جاگ رہی تھیں تو میں کیسے سو سکتا تھا۔

پڑھنے کو تو وہ کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ لیکن معلوم نہیں پڑھ رہی تھی یا کیا کر رہی تھی۔ کیونکہ جب میں اُس کی طرف دیکھتا تو اُسے اپنی ہی طرف دیکھتے پاتا۔ میرے دیکھتے ہی وہ رسالہ پڑھنے لگ جاتی۔ میں ٹرین میں پڑھنے سے زیادہ سوچنے کا قائل ہوں۔ چنانچہ جب کچھ پڑھتا بھی ہوں تو پڑھتا کم، سوچتا زیادہ ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد بدن پر لحاف ڈال کر تیار رہی تو میں نے بھی سونے ہی کی کی تھی۔ بلکہ جب حج صاحب کی آنکھیں کھلی تھیں تو میں نے اپنی آنکھیں ہوند بھی لی تھیں۔ لیکن بغیر نیند کے آخر آنکھیں کب تک بند کئے رہتا۔ چنانچہ تھک کر آنکھیں کھولتی پڑی، باوجود اس نازک پہلو کے کہ سوائے میرے اور اُس کے بقیہ سب ہی اُس وقت ڈبے میں

سوئے ہوئے تھے۔ لیکن اُس طرح آخر کب تک پڑا پڑا  
 روشنی تکتا رہتا۔ چنانچہ ایک طرح سے اُس کے پڑھنے سے شرمندہ  
 ہو کر میں نے بھی اپنی کتاب تیکے کے نیچے سے نکالی اور اس طرح  
 ہم دونوں رسالہ اور کتاب کے پیچھے سے غیر ارادی طور پر  
 آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔

اُس کے چہرے پر ایک عجیب خوبصورت پیمینی دیکھتے  
 دیکھتے صورت حال میرے لئے کسی قدر نازک ہو چلی  
 تھی۔ لحاف اوڑھے رہنے کے باوجود پیروں میں رُہ رُہ کر  
 کتیکسی سی محسوس کرتا۔ بدن کے اوپری حصہ میں گرمی اور  
 بے چینی سی پھیل رہی تھی۔ بانہوں میں انگڑائی ہوتی اور بدن  
 رُہ رُہ کر ٹوٹتا۔ غرض کہ اُس وقت میرے اور اُس کے  
 درمیان جس قسم کا ماحول پیدا ہو گیا تھا وہ میرے لئے  
 ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

پیروں پر کیبل ڈالے وہ بیٹھی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر  
 پر اپنے اوور کوٹ کی جیب سے رومال نکالتی اور ریشمی رومال  
 سے اپنے پتلے پتلے ہونٹوں کو بے وجہ پونچھتی۔ اور کبھی کبھی  
 یوں ہی رومال گال سے لگا کر آنکھیں رسالے میں گڑائے

دیر تک بیٹھی رہ جاتی۔ اُس وقت اُس کی انگوٹھی کے ہیرے کا  
نگ بجلی کی روشنی میں اس طرح چمکتا کہ اُس کی لامحدود دمک  
میں جیسے میری آنکھوں کی روشنی ختم ہونے لگتی۔ انگوٹھی، کن  
پھول اور ناک کی کیل، تینوں کے پتھر سبز رنگ کے تھے۔  
تینوں زیور پتے کے جڑ او کے ایک مکمل سیٹ جیسے تھے۔  
جب میں اُن پتھر کے ٹکڑوں کو دیکھتا اُس وقت میری آتما  
جیسے ایک چھوٹے سے مثلت میں گھر جاتی۔ پتھریلی سبز  
روشنی کے تینوں ٹکڑوں سے بننے والے مثلت کے چکاؤند  
میں میری نگاہوں کے ٹھہرنے کے لئے صرف ایک جگہ  
ہوتی۔ اُس کا بایاں رخسار۔ لیکن رخسار کا بھی ایک حصہ  
اور شاید بہترین حصہ ریشمی رومال سے ڈھکا ہوتا اُس وقت  
گھنگر اُلے بالوں کا ایک کا لپٹھا ریشمی رومال کو چھوتا ہوتا۔  
چنانچہ اُس مثلت کے سبز زادیوں سے جب میں چھوٹتا تو  
گھنگر اُلے بالوں کے اُس تھے میں میری آنکھیں اُلٹھ جاتیں۔  
اور جب اُس سے رہائی ملتی تو اپنے کو ایک اور مثلت میں گھرا  
پاتا، جس کے ایک سرے پر تھے حج صاحب، دوسرے پر  
اُن کی بی بی اور تیسرے پر سویا ہوا موٹا مارواڑی۔

معلوم نہیں وہ ڈرامہ کب تک چلتا رہا۔ میں ٹھیک نہیں بتا سکتا اس وجہ سے کہ بیچ بیچ میں ذہنی غفلت کے مجھ پر ایسے دُورے پڑتے کہ مجھے معلوم نہ ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ بس اُسے دیکھتا اور سوچتا رہا۔ اتنا یاد ہے کہ اُس وقت وہ اپنے پیر میرے ہی برتھ، کے دوسرے سرے پر رکھے بیٹھی تھی۔ پھر اُس نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ دوسرے ہاتھ سے کھسکتا ہوا کنیل سنبھالنے لگی۔ میں نے سمجھا اُسے سردی لگ رہی ہے۔ اس لئے لحاف کا سر اُس کی طرف بڑھانا چاہا۔ اُس کی مسکراتی ہوئی تیز نظر فوراً اُس چھوٹی لڑکی کی طرف گئی، جو میرے اُس کے درمیان سو رہی تھی۔ تب مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اپنی ماں کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے اُس نے میرا لحاف اپنے پیر سے ہٹا دیا۔ اب اپنی مور کھتا کو سوچ کر میں اور شرمندہ ہوا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ وہی گمال سے ریشمی رومال لٹکر رسالہ پڑھنے والی ادا۔ اُس کے بعد اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ کچھ کتنا چاہتی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے کو تیار ہی رکھا پھر وہ آگے کی طرف بڑھی۔ میں بھی

اپنی جگہ سے کھسکا۔ اتنے میں اُس نے اپنا بائیں ہاتھ بڑھا کر  
 داہنی طرف اپنے والدین کو دیکھتے ہوئے مجھے پان کے دو  
 بیڑے پکڑا دیئے۔ پان لیتے وقت میں نے اُس کی بیچ والی  
 انگلی پکڑ لی۔ مُسکراتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے اُس نے میری  
 طرف ایسے دیکھا کہ جیسے اُس کی خوبصورتی انگلی چھوڑانے  
 کے لئے سفارش کر رہی ہو۔ انگلی چھوڑ کر میں اطمینان سے  
 اپنی جگہ پر بیٹھا پان کھا رہا تھا کہ اتنے میں میری نظر ج صاحب  
 پر پڑی۔ اُن کے سوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میں ایک  
 دم ڈر گیا۔

وہ خاموش اپنی جگہ پر بیٹھی اسی طرح ہندی رسالہ پڑھتی  
 رہی۔ زہ زہ کر سوتے ہوؤں کو دیکھتی، پھر مجھے ایک نظر دیکھ کر  
 پڑھنے لگتی۔ مجھے جس چیز سے تشویش ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ  
 اُس کا مُسکراتا کیوں ختم ہو گیا تھا۔ اُس وقت اتنی سنجیدہ لگ  
 رہی تھی کہ اُسے دیکھ کر مجھے فکر ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد اُس  
 نے اپنی جیب سے کچھ نکالا۔ میں نے دیکھا وہ پنسل تھی۔  
 رسالے کے کسی صفحہ پر لکھنے لگی۔ جب وہ لکھنا ختم کر کے رسالے  
 کے پتے میں سے لکھا ہوا حصہ بچھاڑ رہی تھی تو میں نے اپنا ہاتھ

باہر کر کے وقت دیکھنا چاہا۔ اُس وقت وہ خاموش مجھے دیکھ رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔ اُس کی خاموشی نگاہوں کے دیکھنے کی تاب میں نہ لاسکا۔ نظر جھبک گئی۔ اس طرح میں اُس کی نگاہوں کی دعوت قبول نہ کر سکا۔

کچھ دیر باہر اندھیرے میں دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ اُس کے بعد اُس نے گھوم کر سوتے ہوئے سنج صاحب اولہ اُن کی بی بی کو دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اُس نے اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ بڑھایا۔ میں نے اُس کی مدد کی۔ ہاتھ بڑھا کر کاغذ کا ٹکڑا لے لیا۔ اتنے میں اُس کی ماں نے کروٹ بدلی۔ اُس نے چونک کر اُس طرف دیکھا۔ کروٹ بدلتے وقت ماں کی نیند کھل گئی۔ اُنھوں نے ایک بار اپنی لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر سنج صاحب کو۔ اُنھیں سوتے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھیں۔ سنج صاحب بھی جاگ گئے۔ اُنھوں نے آنکھیں مل کر گھڑی دیکھی اور بولے۔ ”پونے تین۔ شاید ایک اسٹیشن اور ہے۔“ لحاف میں سُنہ ڈھکے میں یہ سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ کاغذ کا ٹکڑا میں نے چھپا لیا تھا۔ لیکن سنج صاحب کی بی بی کو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دیکھ کر میں اندر ہی اندر ملجبار ہاتھ اور سوج

رہا تھا۔ آنکھوں نے دیکھ تو نہیں لیا، وہ اٹھی اور ادھر ادھر پھیلا ہوا سامان اٹھا کرنے لگی۔ اب جو کھٹ پٹ ہونا شروع ہوا تو اس بہانے انگریزانی لیتا ہوا میں بھی جھسا گا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر بچوں کو جگکانے اور اٹھانے لگی۔ اس کی سنجیدگی اور خاموشی دیکھ کر میں اندر ہی اندر اس خیال سے گھل رہا تھا کہ آخر اس نے کاغذ کے ٹکڑے پر کیا لکھ دیا ہے جو ایسی ہو گئی ہے۔ ساتھ ساتھ جس بے باکی سے ماں باپ سے باتیں کر رہی تھی اُسے دیکھ کر الگ میرا دم گھٹا جا رہا تھا، اور کونے میں سکوڑا بیٹھا ہی طے کر رہا تھا کہ مجرم کون اور جرم کا ڈر کس کو؟

لیکن میری خوشی مجھ سے الگ ہو چکی تھی۔ جو کچھ بیت چکا تھا اس پر حیرت ہو رہی تھی۔ جو ابھی بتینے کو تھا اُسے سوچ کر دل ابھی سے ڈوبا جا رہا تھا۔ لیکن جو کچھ ہونے کو تھا اُسے دیکھنے کو اپنی ہی آنکھیں کھولے بیٹھا تھا۔ جس وقت میں اپنی لاکھ اُمیدوں سے اُسے دیکھ رہا تھا اسی وقت گاڑی اسٹیشن پر رُک گئی۔ دھیرے دھیرے نچ صاحب کا مال اسباب بھی اترنے لگا۔

مجھے ایسا لگا رہا تھا جیسے میری لاش نکالی جا رہی ہو۔ جج صاحب کو دوسری طرف جانا تھا اور مجھے دوسری طرف۔ لوگ اُترنے لگے۔ سب سے پیچھے وہ تھی۔ جاتے جاتے اُس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کیا۔ دل ایسا اچھلا کہ جیسے مُنہ سے باہر نکل کر اُس کے قدموں پر گر جائے گا۔ اُسے سنبھالتے وقت نمستے کا جواب بھی نہ دے سکا۔ دیکھتے دیکھتے وہ پلیٹ فارم کی بھٹری میں معلوم نہیں کب کھو گئی۔

میری گاڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور اُسے پڑھنے لگا۔ پنسل کی لکھاؤں رسالے کے پھٹے ٹکڑے پر پڑھنا مشکل ہو گیا۔ معدوڑی جاگ گیا تھا۔ اُس نے ہنس کر کہا۔ ”بابو جی! آپ تو پان نہیں کھاتے۔“ ”جان نکل گئی۔ جج صاحب اور اُن کی بی بی نے بھی تو میرے سُرخ ہونٹوں کو نہیں دیکھا۔ کیا مار ڈاڑھی سب دیکھ رہا تھا؟

اویناش ایک دم میری بات کاٹ کر بولا۔ ”وہ کاغذ کا ٹکڑا تمہارے پاس ہے؟“  
میں نے اٹھ کر بیکس کھولا اور کپڑوں کے نیچے بیکس کے



# اُردو ناول اور افسانے

آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہندی اور اُردو دونوں  
دو دنیا کی چیزیں ہیں۔ ہندی اُردو لکھنے اور پڑھنے والوں  
سے مل کر آدمی ایسا محسوس کرتا ہے کہ جیسے ہندی اور اُردو  
دونوں ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف اور دُور ہیں جتنے،  
مثال کے طور پر، انگریزی اور چینی۔ اور اگر آج کے اخباروں  
کو پڑھ کر ہندی اُردو کے درمیانی فاصلہ اور جھگڑوں کو  
آپ سوچتے ہیں تو ہندی اور اُردو کے درمیان جتنی دوری  
آپ محسوس کریں گے اتنی دنیا کی شاید ہی کسی اور دُو  
زبانوں کے درمیان آپ کو نظر آئے گی۔ ساتھ ساتھ  
آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہندی اُردو کی یہ لڑائی  
دُو پہلو انوں کی کوئی کشتی نہیں ہے، جو پہلو انوں کی جسمانی  
صحت اور قوت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ بلکہ یہ دُو

بھائیوں کے درمیان وہ جھگڑ لے جو گھر کو مٹا دینے کا امکان رکھتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے، کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو سچے دل سے یہ چاہیں گے کہ یہ جھگڑا اور بڑھے یا قائم رہے۔ لیکن صرف یہ سمجھ لینے سے کہ یہ جھگڑا ہمارے حق میں اچھا نہیں ہے جھگڑا ختم نہیں ہو جائے گا، کیونکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اس جھگڑے کے پچھے اور بھی بنیادی جھگڑے ہیں۔ مجھے یہاں اُن جھگڑوں سے واسطہ نہیں۔ اس وقت ہمیں صرف یہی دیکھنا ہے کہ آیا بیچ بیچ ہندی اور اُردو کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا ہم لوگ اب سوچنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ہندی اور اُردو کے پورے ادبی دائروں اور زاویوں پر بحث کرنے اور اُن کے جائزے لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہم صرف اُردو نادلوں اور کہانیوں پر نظر ڈالیں گے۔ اُردو نادلوں اور افسانوں کے رنگ دھتنگ دیکھ کر آپ آسانی سے اُن کا مقابلہ ہندی اوپنیا سوں اور کہانیوں سے کر کے دیکھ لیں گے کہ کتنی جلتی ہے۔ دونوں کی دنیا، کتنی متوازی ہیں دونوں کی تاریخیں اور کیسے یکساں ہیں دونوں کے بنیادی مسئلے۔ آپ ہندی

ناولوں اور کہانیوں سے واقف ہیں ہی۔ اس لئے، خاص طور سے وقت کی کوتاہی کی وجہ سے، یہاں یہ ممکن نہ ہو گا کہ اردو کے ساتھ ساتھ ہم ہندی ناولوں اور کہانیوں کا تذکرہ بھی کرتے چلیں۔

اردو ناولوں کی کہانی بہت پرانی نہیں۔ ہندی

اوپنیاس کی طرح اردو ناول بھی ہمارے لئے ایک طرح

سے انگریزی زبان کی دین ہے۔ نذیر احمد کو ہم ایک طرح

سے اردو کا پہلا ناول نگار کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی

پہلی ناول ۱۸۶۹ء میں لکھی۔ اس کے بعد لکھتے ہی رہے

اور اپنی زندگی میں انھوں نے کئی ناولیں مکمل کیں۔

ان کی زبان میں بڑا لوج تھا۔ ہنستے ہنساتے باتیں کہہ

جاتے تھے۔ سماج سدھار ہی ان کی ناولوں کا مقصد

تھا۔ زمانہ وہ تھا جب کہ انگریزی تعلیم کا اثر اور دائرہ اس

دیش میں بڑھتا ہی جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم پائے ہوئے

لوگ بھی انگریزی شاعری یا انگریزی ڈرامہ وغیرہ کے

بہ نسبت انگریزی ناول زیادہ پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے

دھیرے یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں میں ناول پڑھنے کا

روح بڑھنے لگا۔ اس تحریک کی وجہ سے ہندی اور اردو میں بھی نئے نئے ناول لکھنے والے پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ نذیر احمد کے بعد سرشار اور شرر اردو ناول نویسی کے میدان میں آئے۔ رتن ناتھ سرشار کے 'فسانہ آزاد' کا نام تو آپ نے سنایا ہوگا۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ سرشار سے بڑھ کر اردو میں دو سرائوں نگار نہیں پیدا ہوا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ادب اور ادیبوں پر اس تنگ نظری سے سوچنا کتنا غلط طریقہ ہے۔

سرشار کے بعد اردو میں بہت سے ناول لکھنے والے پیدا ہوئے، جن کی فہرست لمبی ہے۔ لیکن حکیم محمد علی خاں، ڈاکٹر سوا اور سجاد حسین وغیرہ کی چیزیں پڑھ کر اس وقت کے اردو ناول کے رجحان کا اندازہ مل سکتا ہے۔ فن کے لحاظ سے ان لوگوں نے ناول نویسی کو کوئی ترقی نہیں بخشی۔ بلکہ انگریزی ناولوں ہی کا اثر چھاتا گیا۔ ناول کے مضامین ضرور وقت کے بدلنے کے ساتھ بدلتے رہے۔

اس کے بعد منشی پریم چند کا زمانہ آتا ہے۔ منشی پریم چند کی جگہ اردو میں وہی ہے جو ہندی میں بلکہ پریم چند کے بارے میں یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ منشی جی دراصل ہندی یا اردو کے

ادیب تھے۔ بہر حال منشی جی کے بارے میں ہم صرف یہی کہنا چاہیں گے کہ ہندوستانی ادب میں پریم چند وہ سورج تھے جس کی روشنی ہندی اور اُردو دونوں ادبوں پر برابر پڑتی تھی۔ پریم چند کے قلم نے اُردو ناول نگاری کو اسی ادنیٰ اور پختگی پر پہنچایا جس پر ہندی ادب نے اس کی لیکھنی کی بدولت پہنچا۔

پریم چند کے بعد یوں تو اُردو میں بہت سے ناول لکھنے والے ہمارے سامنے آئے۔ لیکن میری رائے میں پریم چند کی بلندی کو کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ یورپ کے ادب سے اثر لے کر بہت سے نوجوان لکھنے والے ناولیں لکھنے کی کوششیں کرتے رہے۔ لیکن ان میں سے زیادہ کامیابی کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ ایسی حالت میں صرف نام گنانے سے کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ پھر بھی فیاض علی، راشد انجیری، عظیم بیگ چغتائی، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یوں کہنے کو فیاض علی صاحب کی ناولیں خوب ہی بکتی ہیں۔ انور، شاید بہت جلد تصویر بن کر آپ کے سامنے آجائے گی۔ راشد انجیری کی ماہِ عجم، خوب ہی پڑھی گئی۔

جنتانی تو ہندی میں بھی لکھتے تھے۔ کول تار، اور انگوٹھی کی مصیبت، وغیرہ سے آپ واقف ہیں۔ نیاز فتحپوری زبان ایسی لکھتے تھے کہ اگر ناول نہ بھی لکھتے تب بھی پڑھے جاتے۔ مجنوں گورکھپوری نے اردو ادب کے واسطے جہاں اور بہت کچھ کیا وہاں انھوں نے 'سوگوار شباب' بھی لکھا۔ سجاد ظہیر صاحب لندن گئے تھے اس لئے انھوں نے لندن کی ایک رات، لکھی۔ چونکہ اُس وقت انگریزی میں جاسوسی ناولوں کا زور چل رہا تھا اس لئے اردو میں بھی جاسوسی ناول لکھے جانے لگے۔ نیلی چھتری، بہرام کی گرفتاری وغیرہ کے نام تو آپ نے سنے ہی ہوں گے۔

پریم چند کے بعد اردو ناول لکھنے والے ناکامیاب کیوں رہے، اس پر بحث کرنے کے بجائے اگر اس مسئلہ پر غور کیا جائے کہ اردو میں وقت سے پہلے ناول کی موت کیوں ہو گئی تو بہتر ہوگا۔ میری نظر میں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ناول کے مقابلہ میں افسانہ کا رواج اردو میں ایسا چل نکلا کہ ناول کو کہانی کی کامیابی اور عام قبولیت کو دیکھ کر خود کشی کرنی پڑی۔ یوں تو ہندی میں بھی ناول پر کہانی کی پیداوار اور خوبی بھاری

پڑ رہی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو کی طرح ہندی میں بھی ناول اور ناول لکھنے والے ختم ہو گئے۔

میری سمجھ میں یہ بھی کچھمی ادبی تحریک کا نتیجہ اور اثر ہے۔ زمانہ اور زندگی کا انداز بدل جانے سے کچھمی دلشوں میں افسانے زیادہ پڑھے جانے لگے۔ ناول سے افسانہ کا لکھنا اور پڑھنا دونوں آسان کام معلوم ہوئے۔ آئے دن زندگی کی مصروفیتیں اور پریشانیاں ایسی بڑھتی جاتی تھیں کہ پوری کی پوری ناول لکھنا یا پڑھنا دونوں غیر مقبول ثابت ہوتے گئے۔ آپ پوچھیں گے کہ کیا یہی وجہ ہے اردو ناول کے مرنے کی بھی۔ یعنی کیا ہماری سماجی زندگی نے بھی وہی ڈھنگ یک ایک اختیار کر لئے جن کی وجہ سے کچھمی ملکوں میں ناول پر افسانہ کو برتری نصیب ہو رہی تھی؟ جواب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کو اس وقت بھی ناول پڑھنے کو کافی فرصت تھی۔ ناول لکھنے کا مواد بھی ہماری سماجی زندگی میں اتنا موجود تھا کہ تقریباً پورا پورا فرانسسی روسی یا چینی 'ناولی' ادب یہاں پھر سے ایک بار دوہرایا جاسکتا تھا۔ لیکن انسانی تہذیب اور معاشرت ہمیشہ آسان اور سہل

ہی راستہ سے چلنا پسند کرتی ہے۔ چنانچہ جب ہندوستانی ادیبوں نے وہ سہل راستے یورپ کے افسانہ نویس کے فن سے حاصل کر لئے تو انھوں نے بھی وہی آسان اور مختصر راستے اختیار کر لئے۔ اور غضب تو یہ ہے کہ یہ نقالی اتنی بڑھتی جا رہی ہے کہ حال میں پچھٹی ادب نے جو سستی اور رومانی چھپھلا پن قبول کر لیا ہے وہی آج ہمارے ادب کی بھی وردی بنا جا رہا ہے، حالانکہ یہ عناصر ہماری سماجی یا انفرادی زندگی کی خصوصیت کبھی کبھی نہ تھے۔ یہ ہندی اور اردو لکھنے والوں دونوں ہی پر صحیح اترتا ہے۔

چنانچہ اردو میں اس وقت جتنے چوٹی کے لکھنے والے ہیں وہ سب کے سب اپنا لگ بھگ سارا وقت افسانہ نویسی ہی کو دے رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو افسانے آج اردو میں لکھے جا رہے ہیں وہ اس پایہ کے ہیں کہ انھیں پڑھ کر بت حد تک اردو میں ناول نہ ہونے کے آنسو بچھ جاتے ہیں۔ ان افسانوں کو دیکھ کر ہم یہ بھی کہنے کی ہمت کر سکتے ہیں کہ ہمارے اچھے افسانے دوسرے ملکوں کے اچھے افسانوں کے مقابلہ میں بُرے بھی نہیں ہیں۔

جب ہم موجودہ اُردو افسانہ نگاری کو سوچتے ہیں تو ہمیں  
 علی عباس حسینی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اختر حسین  
 رائے پوری، راجندر سنگھ بیدی، اوپیندر ناتھ اشک، اختر  
 اورینوی، احمد علی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، سہیل  
 عظیم آبادی، محمد حسن عسکری، ممتاز مفتی وغیرہ بیک وقت یاد  
 آتے ہیں۔ پُرانے لکھنے والوں میں نیاز فتحپوری، مجنوں گوکھپوری  
 اور سردرشن وغیرہ جگہ رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہندی کی طرح اُردو  
 افسانہ نگاری میں بھی پریم چند ہی نے ہمیں صحیح راستہ پر لگایا۔  
 لیکن اُن کا طرز اور اثر بہت تیزی سے اُردو افسانہ نگاری  
 پر سے اٹھتا جا رہا ہے۔ اور اگر اُن کا اثر کسی ایک افسانہ نگار میں  
 آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو علی عباس حسینی کے افسانے پڑھئے۔  
 'میلا گھومنی' جسے حسینی صاحب بھی اپنے بہترین کہانیوں میں  
 مانتے ہیں، پریم چند کو جیسے ہمارے سامنے لاکر کھڑی کر دیتی  
 ہے۔ لیکن کرشن چندر سے آگے وہ اثر کم ہونے لگتا ہے۔ اور  
 محمد حسن عسکری اور اُن کے بعد کے لکھنے والوں میں تو وہ اثر  
 قریب قریب بالکل نظر نہیں آتا۔

اُردو کہانی لکھنے والوں کی کہانیاں ہندی میں اکثر چھپتی

رہتی ہیں۔ اشک جیسے کچھ ایسے لکھنے والے بھی ہیں جو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں بیک وقت لکھتے ہیں۔ دیویندر ستیا رتھی کا نام بھی آپ نے اسی سلسلہ میں سنا ہوگا۔ لیکن پھر بھی شاید آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ آخر اردو والے لکھتے کیا ہیں۔ اس لئے آپ کی تسکین کے لئے مختصر طور پر میں اردو افسانہ نگاروں کی مجموعی ادبی کوشش کا خاکہ کھینچنے کی یہاں کوشش کروں گا۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ صرف نمائندے افسانہ نویسوں کو لے کر آگے بحث کی جائے۔

کرشن چندر صاحب کا بچپن چونکہ کشمیر کی وادیوں میں گزرا تھا اس لئے عموماً ان کی کہانیوں کا پس منظر کشمیر ہوتا ہے۔ ان کے افسانے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسے زندگی کا اٹھیں کسی قدر تلخ تجربہ ہے۔ چنانچہ ان کے ہر افسانہ کا موضوع عام طور سے کسی نہ کسی قسم کا شکست ہوتا ہے۔ شکست، نام کی ان کی ایک ناول بھی ہے۔ لیکن دراصل وہ ناول کم، افسانہ زیادہ ہے۔ یعنی اُسے پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ کو گھما پھرا کر ناول بنا دیا گیا ہے۔ کرشن چندر میں یہ خاص قسم کی خوبی یا خامی ہے۔ ان کی بہت سی کہانیاں

ویسے کہنے کو کہانیاں ہی ہیں لیکن اُن میں اکثر ناول کا مواد ہوتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں کبھی کبھی ناولوں کے آثار دکھائی پڑتے ہیں اور اُن کے ناول سے کہانی کی بو آتی ہے۔ مگر اس سے نتیجہ نکال کر میں یہ نہیں کہوں گا کہ کرشن چندر بحیثیت افسانہ نگار اور ناول نگار دونوں حیثیتوں سے ناکامیاب ہیں۔

ان کے افسانوں میں مجھے ”سیما، اور زندگی کے موڑ پر، نام کے افسانے بہت پسند ہیں۔ لیکن یہ دونوں افسانے ناول بھی ہو سکتے تھے۔ اور اسی وجہ سے اُن کے بارے میں میرا تجزیل ہے کہ نہ تو وہ اصلی معنوں میں افسانہ نگار کہے جاسکتے ہیں اور نہ ہی ناول نگار۔ بلکہ اُن کی موجودہ جگہ کہیں درمیان میں ہے، اور وہ شاید ابھی تک طے نہ کر سکے کہ اُن کی پوری بات افسانہ یا ناول میں کہی جاسکتی ہے۔ لیکن کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کرشن چندر بحیثیت ایک افسانہ نویس کے ناکامیاب ہیں۔ اُن کی ”آننگی“ پڑھ کر ایسا کہنے کی کون جرات کر سکتا ہے۔

آج کے لکھنے والوں کی پیٹھ پر ایک قسم کا دیبل، لگا ہونا کچھ لوگوں کی نظر میں ضروری ہو گیا ہے۔ یعنی لکھنے والا تیری پسند

ہے یا نہیں۔ کرشن چندر کو میں ترقی پسندوں کے ساتھ اس وجہ سے رکھتا ہوں کہ وہ اپنے افسانوں کی مدد سے عام طور سے سرمایہ داری کی مخالفت اور اشتراکیت کا پرچار کرتے ہیں۔ اشتراکی ہونے کی وجہ سے جگ جیون پر نکتہ چینی کرنا کسی قدر ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن کرشن چندر کی نکتہ چینی کا بھی ایک خاص ڈھنگ ہوتا ہے۔

ان کے افسانے چھوٹے چھوٹے قصوں، کہانیوں، واقعات اور چٹکلوں کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پلاٹ، ہونا ضروری نہیں۔ چلتے پھرتے واقعات پر ایک خاص نظریہ کے ماتحت روشنی ڈالنا اور اس طرح پورے سماج اور انسانی زندگی پر چھینٹ ڈالنا ان کی مخصوص ادائیگی ہے۔ جیسے یہاں سمجھنے کے لئے مان لیجئے کہ آج دیوالی کی رات ہے۔ گھر گھر چراغ جلے ہوئے ہیں۔ کافی رات ہو جانے سے کچھ چراغ بجھ بھی چکے ہیں، بہت سے بجھنے والے ہیں۔ بقیوں کی زندگی کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں۔ اسی وقت ایک گدھا شہزاد کے کسی کونے سے زور زور سے رینگنا شروع کرتا ہے۔ کرشن چندر گدھے کے اس رینگنے کو رینگنا نہیں کہیں گے بلکہ

اُسے اُس کا رونا یا ہنسنا بتائیں گے۔ پھر گدھے کے رینگنے سے کچھ اس قسم کے نتیجے نکالیں گے۔

اے دنیا والو، تمہاری آتماؤں میں تازہ کی گھس چکی ہے کیونکہ تمہاری زندگی پر سرمایہ داری چھائی ہوئی ہے۔ اگر چراغ جلا کر کبھی اپنا ضمیر روشن کرنا چاہو تو تم کا میاں نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ دیکھو تمہاری مفلسی تیل کی قلت کی وجہ سے تمہارے جلائے ہوئے چراغوں کو بجھائے دے رہی ہے۔

یہ رہے کرشن چندر۔ انکے بعد سعادت حسن منٹو کی جگہ اردو افسانہ نویسی میں آتی ہے۔ لیکن منٹو صاحب معلوم نہیں کیوں باوجود ایک اچھے کلاکار یا فن کار اور نہایت ہی ذہین آدمی ہونے کے اپنے افسانوں کا مضمون صرف جنسیات بنائے ہوئے ہے۔ ویسے تو ان کے افسانوں میں عورتیں ہیں، شراب ہے، سگریٹ کا دھواں ہے، طوائفیں ہیں، تحلیل نفسی (Psychoanalysis) ہے، اور منٹو صاحب خود بھی ہیں۔ لیکن منٹو کے افسانوں کا موضوع خاص طور سے صرف عورت ہے، یعنی جہاں عورت ختم ہوتی ہے وہیں منٹو کے افسانے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس کرشن چندر کے افسانے عموماً وہیں سے شروع ہوتے

ہیں جہاں عورت ختم ہو جاتی ہے۔ منٹو اور کرشن چندر کے آرٹ، میں یہ سب سے بڑا فرق ہے۔

ہانڈی کے چند چاولوں کو ٹٹول کر کچھڑی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اردو افسانہ نگاری کا مجموعی طریقے سے جائزہ لینے کی غرض سے اگر دو اور لکھنے والوں کا ذکر ہو جائے تو کسی حد تک کام چل جائے گا۔

یہ دو حضرات ہیں علی عباس حسینی اور محمد حسن عسکری۔ ویسے لکھنے کو حسینی صاحب اب بھی لکھتے ہیں۔ لیکن تاریخی رو کے حسینی کرشن چندر سے بھی پہلے آتے ہیں۔ عسکری کرشن چندر سے بہت بعد میں آتے ہیں، حالانکہ لکھنے کو دونوں اس وقت ساتھ ساتھ لکھ رہے ہیں۔ عسکری ابھی بالکل نوجوان ہیں یا یہ کہتے کہ بہت نوجوان ہیں۔ حسینی اگر بوڑھے نہیں تو جوان بھی نہیں ہیں۔ حسینی کے ایک مجموعہ کا نام ہے 'باسی پھول'۔ معلوم نہیں یہ ان کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے یا نہیں۔ لیکن معلوم نہیں کیوں یہ نام مجھے ٹھیلانے سے نہیں بھولتا۔ بلکہ جب حسینی صاحب کو سوچتا ہوں تو 'باسی پھول' یاد آتا ہے اور جب 'باسی پھول' سوچتا ہوں تو حسینی یاد آتے ہیں گویا

اُردو افسانہ نگاری میں حسینی باسی پھول ہیں۔  
 عسکری موجودہ افسانہ نگاروں میں سب سے نئے مانے جاتے  
 ہیں، حالانکہ اُردو میں افسانے لکھنے والوں کا سلسلہ اُن کے  
 بعد کچھ ٹوٹ نہیں گیا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو  
 پھر اُن کو حسینی سے کیا نسبت؟ لیکن میری نظر میں نسبت  
 ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان دو توں لکھنے والوں کے درمیان ہمیں  
 جو فاصلہ ملتا ہے وہی ترقی یا تترلی کی منزلیں اُردو افسانہ  
 نگاری بچھلے پچیس سالوں میں طے کر پائی ہے۔

عسکری پر خاص طور سے فرانس کے ادیبوں کا اثر  
 ہے، اتنا کہ اُن کے آرٹ میں بھی کبھی کبھی وہی موہومیت  
 نظر آتی ہے جو آخری اُنیسویں صدی کے فرانسیسی فن کاروں  
 کی تصنیف کی خصوصیت تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح  
 ہے کہ اگر خدا کی مہربانی سے آپ نے اُن کے افسانوں کا  
 مطلب سمجھ لیا تو پھر کیا کہنا ہے۔ سمندر کی تہ میں پہونچکر  
 موتی ملتے ہیں، قطب مینار پر چڑھ کر دلی دکھائی دیتی ہے۔  
 یہی ہے عسکری کا آرٹ۔

لڑکیاں اُن کے افسانوں کی بھی تانا بانا ہوتی ہیں۔ لیکن

ان کی لڑکیوں کی چند خصوصیتیں ہیں۔ یعنی عام طور سے یہ لڑکیاں غریب عیسائی گھرانوں کی ہوتی ہیں۔ سانولی یا کالی، تھوڑی پڑھی لکھی، قبول صورت یا غیر قبول صورت لڑکیاں۔ لیکن ایک ایک کے دل میں آگ کے دہکتے ہوئے جیسے کہاروں کے آنوے کے آنوے چھپے ہوئے ہیں۔

بحیثیت ایک اچھے اور اونچے افسانہ نگار کے جگ جیون پر یہ بھی نکتہ چیں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اس میں ان کا ڈھنگ بالکل مختلف اور عجیب ہے۔ بس سمجھنے کے لئے ہوسٹل میں رہنے والی دو ایسی لڑکیوں کو سوچیے جو ایک لحاف کے نیچے سوئی ہوئی ہیں۔ ایک لڑکی کے داہنے پیر میں کالا موزا ہے اور بائیں پیر میں سفید موزا۔ دوسری لڑکی کے داہنے پیر میں سفید موزا اور بائیں پیر میں کالا موزا ہے۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے موزوں کو دیکھتی ہیں اور اندر ہی اندر اپنے اور ساتھ ساتھ جگ جیون پر کڑھتی ہیں۔ لیکن بات یا تو کہتا نہیں چاہتیں یا سمجھتی نہیں ہیں۔ موزے بدل کر ایک کے پیروں میں صرف سفید اور دوسرے کے پیروں میں صرف کالے موزے ہو سکتے ہیں لیکن ہوتے نہیں۔ اور اگر ہو سکتے

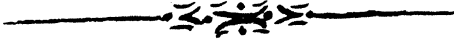
ہیں تو کیا لڑکیاں موزے بدل لیں گی؟ اگر آپ عورت کی فطرت سے واقف ہیں تو جواب دیں گے، نہیں، لیکن اگر لڑکیاں آپس میں موزے بدل بھی لیں تو کیا وہ خوش ہو سکیں گی؟ عسکری صاحب مسکرا کر اپنے مخصوص لہجہ سے کہیں گے۔ ”جی نہیں۔“

اخیر میں یہ کہنے دیجئے کہ اردو ناولوں اور افسانوں میں تقریباً وہی باتیں اور وہی مرحلے ہیں جو ہندی میں آپ کو ملتے ہیں۔ وہی دکھ، وہی حُسن و عشق، وہی غریبی کے دکھڑے اور امیری کے گھمنڈ، وہی آدمی کی مایوسی اور ناکامی بھی۔ اردو لکھنے والے ہندی لکھنے والوں سے بہت مختلف نہیں ہوتے۔ ویسے یہ صحیح ہے ہی کہ کسی کو کچھ سوچتی ہے، کسی کی نظر کسی پر جاتی ہے۔ اپنے اپنے لکھنے کا ڈھنگ الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ باتیں آپ کو ہندی کے لکھنے والوں میں بھی ملیں گی، ورنہ سب ہی ہندی کے ادیب ایک ہی سی اور ایک ہی بات نہ لکھتے ہوتے۔

اے ہاں، بھولا ہی جا رہا تھا۔ ایک بات اور۔ ہندی

کی طرح اردو میں بھی بسبت سی عورتیں اور لڑکیاں کہانیاں اے ناول لکھنے والی آپ کو ملیں گی۔ چنانچہ اردو میں بھی

اس قسم کے نازک قلم لو ہے جیسے سخت مضامین پر چل  
 رہے ہیں۔ ان کی تعداد اب اچھی خاصی ہو رہی ہے۔  
 لیکن خاص طور سے عصمت چغتائی صاحبہ اپنے قلم  
 کی بدولت اردو میں اچھا خاصہ درجہ حاصل کر چکی ہیں۔



# بیمار

تین سال بیت گئے۔ شیل کسل کی شادی ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک بڑے شہر میں رہتی تھی۔ خاوند اس کے کسی اچھے اخبار میں مقامی نامہ نگار تھے۔ اخباروں کے نامہ نگاروں کی زندگی یوں ہی کتنی مشغول ہوتی ہے، اور اگر نہیں ہوتی تو اسے مشغول بنائے رہتے ہیں۔ لیکن ایک بڑے انگریزی روزانہ اخبار کا نامہ نگار ہونا بھی دراصل کوئی چیز ہے۔ اور شیل کسل کے خاوند تو مقامی نامہ نگار تھے۔ جہاں سے اخبار نکلتا ہے، وہاں کے مقامی نامہ نگار کی خاص ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور شہر بھی کتنا بڑا تھا، جہاں سے وہ انگریزی روزانہ اخبار نکلتا تھا۔

اگر کام زیادہ نہ بھی ہو تب بھی، نامہ نگاروں کی جیسی عادت یا فطرت ہوتی ہے، وہ اپنے کو مشغول بنائے رہتے ہیں۔ اس کی

شاید یہ وجہ ہے کہ نامہ نگاروں کا کام ہی ایسا ہوتا ہے کہ، وہ چاہیں یا نہ چاہیں، اُن کی زندگی کو مشغول ہونا پڑتا ہے۔ اور جب عام طور سے ایسا مانا اور سمجھا جاتا ہے تو نامہ نگار کو، اگر اُسے اپنی زندگی کا میاں بنانا ہے، مجبوراً اپنے کو مشغول رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر وہ مشغول نہیں ہے یا اپنے کو مشغول نہیں بنائے ہوئے ہے تو دوسرے سمجھیں گے کہ وہ اچھا یا کامیاب نامہ نگار نہیں ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے کان سے کھونٹ نکالنے والوں کو باجی آراؤ پیشوایانانافرنولس کی طرح پگڑی باندھے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کان سے کھونٹ نکالنے کو مرہٹا بادشاہوں کی طرح پگڑی باندھنے سے، نزدیک یا دور کا، کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ پھر بھی پیشہ تو پیشہ ہی ہے۔ اور جب آدمی کسی پیشہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی روایتوں کو اُسے ماننا ہی پڑتا ہے، ورنہ بغیر مراہٹھی پگڑی باندھے گلیوں گلیوں مارا پھرے کوئی بھی کھونٹ کا ہے کو نکلو اے گا۔

یہ پیشے کی بات ہے اور اسے پیشہ والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ روزانہ اخبار کے نامہ نگار کی کیا زندگی ہوتی ہے یہ وہی

جانتا ہے یا شیل کمل جانتی تھی۔ نامہ نگار عموماً ایک عجیب دنیا میں رہتا ہے، اور اُس ذہنی دنیا میں اُس کی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اُس کی نظر میں دنیا دنیا نہیں ہوتی، بلکہ دنیا خیر ہوئی ہے۔ وہ دنیا کو دنیا سمجھ کر نہیں دیکھتا پہچانتا، بلکہ دنیا کو ایک بہت بڑی خیر سمجھ کر اُس کے لئے بھاگتا دوڑتا رہتا ہے۔ اُس کے واسطے کسی کا مرنا مرنا نہیں ہے، بلکہ خیر ہے۔ کسی کا جینا اُس کے لئے جینا نہیں ہے بلکہ خیر ہے۔ غرض کہ دنیا کی ہر چیز اُس کے لئے خیر ہے، اُس کا اختیار بھی خیر ہے، اپنی بی بی کے لئے وہ خود خیر ہے اور شیل کمل اُس کے لئے خیر ہے۔

ایسے کے ساتھ جب شیل کمل کی شادی ہوئی تھی تو اُس کی زندگی کیا اور کس قسم کی ہو سکتی تھی اسے سوچنے میں اُس کو زیادہ دیر نہ لگی۔ ویسے تو خاوند اُس کے ہر وقت مشغول رہتے تھے لیکن ان دنوں خاص طور سے اُن کی زندگی جیسے طوفان ہو رہی تھی۔ اُن کی نظر میں دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہر وقت ہو رہا تھا، اور اُس فیصلے میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا، کیونکہ اُس فیصلہ کی خیر دنیا کو دینا اُنھیں کا کام تھا، ورنہ دنیا والوں کو کیسے معلوم ہوتا کہ دنیا کے ساتھ یک بیک کیا گذر گیا۔

اس کے علاوہ، گگ بھگ دس لاکھ آبادی کے ایک  
 صنعتی اور روزگاری شہر کا مقامی نامہ نگار ہونا بھی کوئی معمولی  
 بات نہیں، جہاں چھوٹی بڑی ہڑتالیں روز ہوا کرتی ہیں، جہاں  
 مل مالکان کو مزدوروں سے ہمیشہ شکایت رہتی ہے، جہاں  
 پونجی مشقت کا خون چوس کر بڑھتی ہے، جہاں دولت کی روشنی  
 میں مغسی اپنا چراغ ہر شام جلاتی ہے، جہاں کچھ رات گئے  
 اور کچھ رات رہے طوائفیں اپنے دروازے کھولتی اور بند کرتی  
 رہتی ہیں، جہاں آدمی کے ہاتھوں آدمی کا خون اور پسینہ روز  
 بنتا اور بکتا ہے، جہاں قتل کی نگرانی پولیس ہر وقت کرتی ہے  
 اور جہاں قاتل کو حکومت پھانسی کے تختہ پر روز پہنچاتی ہے۔  
 اور پھر یہ توڑاٹی کا زمانہ ہے۔ دنیا اور زمانہ کو جیسے آگ لگی  
 ہوئی ہے۔ پیسہ بچکنگ رہا ہے اور پیسہ بن رہا ہے۔ آدمی کے دل  
 میں خوف ہے اور امید بھی۔ دنیا بگڑ رہی ہے اور بن بھی رہی  
 ہے۔ دہشت ناک ہل چل ہر وقت پھیلتی رہتی ہے۔ سمجھ میں نہیں  
 آتا کہ لوگ جا کہاں رہے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ کل کیا ہوگا۔  
 جگہ جگہ سے انتہا کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ مزدوروں کی  
 بستیاں سوکھی لکڑی کی ڈھیر بنی ہوئی ہیں۔ انھیں بستیوں میں

چوہے رہتے ہیں، جو رات ہی کو اپنی بلوں سے نکلنے ہیں۔ ایک بستی سے دوسری بستی اور پھر دوسری سے تیسری بستی میں چلے جاتے ہیں مزدوروں کے جھونپڑوں میں چھکے چھکے باتیں کرتے ہیں، جو نہ مزدور سمجھتے ہیں اور نہ وہ خود سمجھتے ہیں۔ صبح کو جب یہ چوہے اپنی بلوں میں پھسپ جاتے ہیں تو بجلی کے کھمبوں پر دیواروں اور مل کے پھاٹکوں پر لال لال اشتہار چکے نظر آتے ہیں۔ رات کو بڑے بڑے جلوس ہاتھوں میں مشعل اور تیلی لے نکلنے ہیں۔ جب گھوڑوں کی ٹاپ سُنائی دیتی ہے تو یہ مشعلیں اور بتیاں بچھ جاتی ہیں۔ پھر دُور سے آسمان پھاڑنے والے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ جلوس نکل جاتے ہیں تو دُور دُور سے 'ہو، ہو، کی آوازیں آتی ہیں۔ آدھی رات کو سیار بولتے، اُلو چنچتے اور گتے بھونکتے ہیں۔ گتے ایسے بھونکتے ہیں جیسے شہر کے باہر مشین گن، ککاٹو، ککاٹو، کر رہی ہو۔ ان آوازوں سے سونے والے شہری چونک اُٹھتے اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ جیسے شہر کے باہر دشمن آگئے۔

یہ سب کچھ تھا۔ لیکن کچھ نہ تھا جب تک کہ نام نہ لگاواں سب کی خبر چھپنے کو اخبار میں نہ دیتا۔ ایسی زندگی تھی شیل کے

شوہر کی۔ وہ شیل کمل کو بہت سمجھاتا، لیکن وہ زیادہ سمجھنے پاتی۔

.....

جاڑے کی رات تھی۔ شیل کمل اور اُس کے شوہر آتشخان کے پاس صوفے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نوکر نے باہر سے آکر اطلاع کی کہ کوئی ملنا چاہتا ہے۔ جاڑے پالے میں باہر کون جاتا۔ اس لئے نامہ نگار نے آنے والے کو کمرہ ہی میں بلوایا۔ سوتی کپڑے کا کوٹ اور پتلون پہنے، ہاتھ میں چمڑے کا تھیلالے، ایک آدمی کمرہ میں داخل ہوا۔ نامہ نگار نے سامنے کی کرسی پر اُسے بیٹھنے کو اشارہ کیا۔ آدمی کا بدن چوڑا اور مضبوط لیکن دُبلاتا تھا، اور چہرہ وقت سے پہلے بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ نامہ نگار آدمی سے باتیں کر رہا تھا اور شیل کمل پریشان اُس کی بگڑی داڑھی اور سر کے بکھرے ہوئے بڑے بڑے بالوں کو دیکھ کر حیرت کر رہی تھی۔ بیمہ کمپنی والوں سے کون نہیں جان بچانا چاہتا۔ لیکن نامہ نگار زیادہ پریشان ایجنٹ کے عجیب و غریب حلیہ سے تھا۔ ایجنٹ کا اتنی رات کو آنا بھی کم پریشان کرنے والی چیز نہ تھی۔ لیکن اُس کی پریشانی کی سب سے بڑی وجہ خود ایجنٹ کی پریشانی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ بھول کر یا غلطی سے چلا آیا تھا۔ اور

اُس کی پریشانی کی صحیح وجہ بھی اُسی وقت معلوم ہو سکی جب اُس نے شیل کمل کو متوجہ کر کے کہا۔ ”آپ نے پہچانا نہیں؟“ صورتِ حال کو سمجھ کر اور اُس پر قابو پا کر شاید اُس نے طے کر لیا تھا کہ بغیر اُس جملہ کے شیل کمل کی پریشانی کم نہ ہوگی۔

شیل کمل جیسے ڈر کے جذبہ پر قابو حاصل کرتے ہوئے، لیکن اپنی آنکھوں کا اب بھی یقین نہ کر کے۔ ”کیوں ہریش بابو! آپ؟“

نامہ نگار اپنی آنکھوں سے شیل کمل اور ایجنٹ دونوں کو کھانے ڈال رہا تھا۔ اور جب کسی طرح اپنی پریشانی پر وہ قابو نہ پاسکتا تو اُس نے شیل کمل کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ”آپ جانتی ہیں انھیں؟“ شیل کمل نے مسکرا کر ’ہسی ہوئی خوشی کو دباتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں، ہریش بابو! پھر آنکھیں اٹھا کر اپنے خاوند کی طرف اطمینان سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”ہریش بابو! آپ کو یہ کیا سوچھی جو اس طرح بھیس بنا کر ایسے وقت آئے؟ کیا ڈرانا چاہتے تھے؟“

ہریش کو مجبوراً پوری کہانی اُس وقت سے سنانی پڑی جب سے وہ شیل کمل سے الگ ہوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ پڑھنا

لکھنا چھوڑنے کے بعد کچھ دنوں تک تو وہ بہار کے زلزلہ کے مارے ہوؤں کی مدد کرتا رہا۔ لیکن زیادہ دنوں تک بھوڑوں کے دکھیوں کی خدمت نہ کر سکا کیونکہ جلدی اُس کی سماج سیوا سرکار کے نظروں میں کھٹنے لگی۔ چنانچہ مجبور ہو کر وہاں سے اُسے روانہ ہونا پڑا۔ لیکن اسپٹ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ بیمہ کا کام اسی خیال سے شروع کیا۔ مگر جب سی۔ آئی۔ ڈی کو یہ شبہ ہوا کہ وہ بیمہ کے اشتہاروں سے زیادہ ضروری چیزیں اپنے تھیلے میں لئے پھرتا ہے تو پولیس اُس کے پیچھے پڑ گئی۔ چنانچہ اس طرح اب سال بھر سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ یہاں سے وہاں بھاگتا پھرتا ہے۔ کہیں ایک جگہ زیادہ دن تک نہیں ٹھہر سکتا۔ شہر میں اگر رہتا ہے تو صرف رات کو نکلتا ہے۔ لیکن عام طور سے وہ شہر سے دور رہتا ہے۔ ضروری کام پڑنے ہی پر شہر آتا ہے۔

شیل گل سہمی ہوئی ہریش کی داستان سنتی رہی۔ کمرہ میں سوائے ہریش کی دھیمی آواز کے مکمل خاموشی تھی۔ باہر جاڑے کی رات دنیا کو دہلے بیٹھی تھی۔ دُور کہیں سے گتے کی بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ گتے کا بھونکنا سن کر وہ بار بار باہر دیکھتی اور

پھر ہریش کے چہرے پر گہری جھرتیوں اور لکیروں کو دیکھتی۔ ہریش پورے ماحول کا مالک بنا بیٹھا تھا، جس میں شیل کمل اور اور نامہ نگار کھلونوں جیسے کھوئے ہوئے بیٹھے تھے۔ ہریش دونوں کی پریشانی کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا اور اُسے یہ بھی شبہ ہوتا کہ دونوں شاید اب بھی ڈر رہے ہیں۔ چنانچہ جیسے دونوں کی منبضوں پر اٹھکیں رکھتے ہوئے اُس نے کہا: ”بھوکا کتنا جا رہا ہے کی اندھیری رات میں، کہیں بھونک رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ پھیلا یا۔

— ”پانچ روپیہ آپ اور پانچ روپیہ آپ۔“

شیل کمل اور اُس کے خاندان دونوں پریشانی کی حالت میں اُسے دیکھتے رہے۔ شیل کمل اندر گئی اور ایک ہاتھ میں دس روپیہ کا نوٹ اور دوسرے میں چابی کا چھالنے یا ہر آئی۔ اُس کے ہاتھ سے نوٹ لیتے ہوئے ہریش نے مسکرا کر کہا: ”غریبوں کے لئے۔“

اُس رات کو شیل کمل کے اوپر جویتی وہ شیل کمل ہی جانتی ہے۔ اپنے خاندان کے ساتھ سوتے سوتے کانپ کر یکایک وہ چلا اٹھی۔ نامہ نگار نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا: ”کیا ہوا کمل؟“

سہمی ہوئی، شیل کمل نے بچوں جیسی آواز سے بتایا۔ شاید  
 خواب دیکھ رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھا ایک کتا بھونک رہا تھا۔  
 باہر جا کر اندھیری رات میں کھو گیا۔  
 کچھ دیر ڈری ہوئی خاموش بیٹھی سامنے دیوار پر لکتی رہی۔  
 پھر اُس نے ہلکے لہجہ سے کہا: "اُس کو میں سمجھی نہیں۔"

.....

شہر سے وہ جگہ قریب ۶۳ میل کی دوری پر ہے۔ لگ بھگ  
 ۲۰ میل تک تو پکی سڑک ہی چلی جاتی ہے۔ اُس کے بعد کئی سڑک  
 چھوڑنا پڑتا ہے، کیونکہ پکی سڑک دکھن کی طرف نکل جاتی ہے۔  
 جہاں سے پکی سڑک چھوڑتی ہے وہیں سے جنگل کا حاشیہ شروع  
 ہو جاتا ہے۔ اصل میں وہیں سے جنگل اور پہاڑ دونوں شروع  
 ہوتے ہیں۔ اسی پہاڑی جنگل میں سے ہو کر وہ لیک نکلی  
 ہے، جس پر مشکل سے ایک بیل گاڑی نکل سکتی ہے۔ آدمیوں  
 کے چلنے کے نشان البتہ صاف نظر آتے ہیں۔ لیک دور جنگل  
 اور جھاڑی کے اندر جا کر ٹیڑھی میڑھی ہونے لگتی ہے۔  
 راستہ میں اکثر گڈھے ملتے ہیں۔ پتھر کی بڑی بڑی چٹانیں  
 تو قدم قدم پر ہیں۔ پتھر کے ٹکڑوں کے درمیان کانٹے دار

جھاڑیاں اُگی ہیں۔ جھاڑیاں اتنی گنجان ہیں کہ ان کے بیج سے نکلنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ صرف جانوروں کے پیروں کے نشان جھاڑیوں کے بیج میں نظر آتے ہیں۔ جھاڑیوں، پتھروں اور گڈھوں کی وجہ سے راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا جاتا ہے، یعنی راستہ اتنا ٹیرھا میٹرھا ہے کہ اُس پر کھڑا ہو کر جھاڑیوں کی وجہ سے سامنے بیجاں گز بھی آگے دیکھا نہیں جاسکتا۔ لیکرستی کی طرح دائیں بائیں گھومتی اور چکر کھاتی ہوئی آگے معلوم نہیں کہاں چلی جاتی ہے۔

اُس لیک سے سات ہی آٹھ میل لگے جا کر پتھر چٹا ملتا ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ پتھر ہی پہاڑ ہے۔ لیکن خاص طور سے اس جگہ کا نام پتھر چٹا اس وجہ سے ہے کہ یہاں کبھی پتھر کی کھودائی ہوتی تھی۔ یہیں سے لمبی لمبی اونچی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہاڑیوں کے نیچے سُرخ رنگ کا پتھر ملتا ہے، جس کی کسی زمانہ میں یہاں کھودائی ہو کر تی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس جگہ کا نام پتھر چٹا پڑ گیا۔ لیک یہیں سے ایک پہاڑی پر چڑھ کر معلوم نہیں کس طرف چلی جاتی ہے۔ اوہیں سے لیک چھوڑ کر داہنے طرف جانے کے لئے پلگڈنڈی

پکڑنا پڑتا ہے۔

پتھر جیٹا سے داہنے طرف چلتے وقت جنگل بہت گھنے ہو جاتے ہیں۔ آدمیوں کے آنے جانے کا کوئی راستہ یہاں نہیں ہے۔ صرف جنگلی جانوروں کے پیروں کے نشان یہاں وہاں نظر آتے ہیں۔ ہرن اور نیل گائے کی منگنی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگلی جانوروں کے رہنے کی جگہ ہے۔ جنگلی سوردوں نے پودوں کی جڑوں میں تھوخن سے گڑھے بنا دئے ہیں۔ برسات میں جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو سوراخیں پودوں اور درختوں کی جڑوں میں کھود کر کھاتے ہیں۔

لگ بھگ آٹھ میل تک ایسے ہی گھنے جنگل ملتے ہیں۔ یہاں سے ہو کر گزرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ خاص طور سے گجاندی کے نزدیک پہنچ کر راستہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ تیندوے وہیں رہتے ہیں جہاں ہرنوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ لیکن گجاندی کے پاس جہاں جنگل بہت گھنا ہو گیا ہے، دن کے وقت اکثر چیتے بھی نظر آجاتے ہیں۔ دریا کے کنارے جب چیتے پانی پینے آتے ہیں تو شکاریوں کے

بھاگ گھل جاتے ہیں۔ لیکن یہاں شکاریوں کا گزر کہاں۔  
یہاں تو بغیر ہتھیار کے آدمی تو دو چیتوں کے شکار رہن  
جاتے ہیں۔

دریا پہاڑی ہے اس لئے برسات کے علاوہ ہر موسم  
میں سوکھا رہتا ہے۔ دریا کی تہ میں صرف پتھر ہیں جاڑے  
اور گرمی میں پتھر ملی تہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ دیکھنے سے  
ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی نے پتھر گھس کر دریا کی تہ میں  
بھا دیا ہے۔ پتھروں کے بیچ سے پانی کے تیلے تیلے سوتے  
جاڑے اور گرمی میں بھی بھری سے بہتے رہتے ہیں۔ آدمی  
ان پتھروں پر سپر رکھ کر اس پار سے اُس پار چلے جاتے ہیں۔

دریا اس طرح پار کرتے وقت کبھی کبھی پانی ریلتا ہوا  
آجاتا ہے اور بھاگنے والے بھاگ بھی نہیں پاتے۔ پہاڑی  
ندی کے برساتی پانی کے ساتھ بہنے والوں کے سر پتھروں  
سے ٹکرا ٹکرا کر چور ہو جاتے ہیں۔ دریا کے بیچ انھیں پتھروں  
کے دراروں میں گھڑیاں بیٹھے رہتے ہیں، جو دریا پار کرنے  
والوں پر دم سے چوٹ کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔  
جاڑوں میں دن کے وقت گھڑیاں اور گونٹے پانی سے

نکل کر پتھروں پر دھوپ کھاتے دکھائی دیتے ہیں۔  
 دریا پار کر کے ایک میل جانے پر بانڈ اراج کی سُونی  
 چھاؤنی بنتی ہے۔ چھاؤنی کو دیکھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ  
 وہاں وہ کس غرض سے بتی ہوگی، کیونکہ نہ تو کوئی چھاؤنی میں  
 رہتا ہے اور نہ اُس کے دس پانچ میل آس پاس کوئی آبادی  
 ہی ہے۔ بانڈ اراج ایک زمانے سے، کورٹ، کے ماتحت ہے۔  
 اس لئے اب یہاں نہ کوئی آتا ہے اور نہ اُس کی مرمت کراتا  
 ہے۔ آس پاس کے جنگل اور ساری زمین بانڈ اراج ہی کی  
 ہے۔ اس لئے چھاؤنی راجہ صاحب کا شاید قبضہ دکھانے  
 کے لئے بنی ہو۔ راجہ بانڈ اشکار کے لئے جب آتے رہے  
 ہوں تو شاید اسی چھاؤنی میں ٹھہرتے بھی ہوں۔ چھاؤنی  
 کے لئے ایک مہتو یعنی چوکیدار اب بھی مقرر ہے، جو چھاؤنی  
 سے آٹھ میل کی دوری پر رہتا ہے، جہاں اُسے تیس ایکڑ  
 زمین معافی ملی ہے۔ چھاؤنی میں تالا اُسی کا بند رہتا ہے،  
 اور اُس تالے اور چھاؤنی کی لگرائی گا ہے ما ہے وہ اب بھی  
 کر جاتا ہے۔

چھاؤنی میں ان دنوں ہریش رہتا تھا۔ ساتھی اُس کے  
 کئی تھے جو آتے جاتے رہتے تھے۔ مستقل ساتھی اُس کے  
 دہری تھے، ٹائپ رائیٹر اور سائیکلو اسٹائل مشین۔ اس  
 کے علاوہ بہت سے پُرانے اخباروں اور چھپے اور سادہ  
 کاغذوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ لیکن جب سے ہریش بیمار  
 پڑا اُس وقت سے ٹائپ رائیٹر بھی بیمار تھا اور سائیکلو اسٹائل  
 مشین بھی۔ کاغذ اور کتابیں الگ بکھری پڑی تھیں۔ ہریش  
 کی تیمارداری کے لئے پارٹی نے کامریڈ واکڈ کو بھیج  
 دیا تھا۔

ہریش اپنے ساتھ ہومیو پیتھی دوائیوں کا ایک بکس بھی  
 رکھتا تھا۔ معلوم نہیں کب کیسا اتفاق پڑے۔ پارٹی کی  
 طرف سے تھوڑی پنجر، روٹی اور مرہم وغیرہ بھی رکھنے  
 کی تاکید تھی۔ چوٹ وغیرہ لگنے پر مرہم پٹی وہیں کی وہیں  
 ہو سکتی تھی۔

اپنے ساتھ ہریش ایک ریوالور بھی رکھتا تھا جس کی  
 اجازت بارڈر کی طرف سے نہیں تھی۔ لیکن جنگل اور ہیاڈوں  
 پر کئے گئے وقت اُس کے ہونے سے ہریش ہی کی نہیں

بلکہ پارٹی کے دوسرے ممبروں کی بھی ہمت بندھتی تھی۔ بہار کے زلزلے کے زمانہ میں ریواور ہرش کو اُس کے ایک پُرانے انقلابی دوست نے رکھنے کو دیا تھا، جسے کبھی لوٹانے کا موقع نہ آیا۔ لیکن اس کے علاوہ خود ہرش کو جو بات نہ معلوم تھی وہ یہ تھی کہ اچھا خاصا کامریڈ ہوتے ہوئے بھی وہ بجد جذباتی تھا۔ چنانچہ جو پرانی چیزیں اُس کے پاس پڑی رہ گئی تھیں انہیں چھوڑنا وہ گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح اُس کے منی بیگ میں ایک پرانی کیرم کی گوٹ بھی پڑی تھی۔

دیر سے واگڈا باہر برآمدہ میں بیٹھی تھی۔ مکان کے بائیں طرف سے کسی کے آنے کی آہٹ ملی۔ اُسے چڑھسی ہوئی۔ واگڈا نے سوچا کجخت مہتو پھر آیا۔ لیکن جب چھاؤنی کے مہتو کے بجائے کامریڈ انور نظر آیا تو اُسے بہت تسکین ہوئی۔ انور برآمدہ میں چڑھتے وقت اپنے دونوں پیرزین پر شکنے لگا تا کہ جوتے سے کچھ نکل جائے۔ مِس واگڈا نے ہونٹوں پر اٹھکی رکھ کر اُسے آواز پیدا کرنے سے روک دیا۔ انور نے آہستہ سے چھاتہ برآمدہ میں سوکھنے کو رکھا اور آکر واگڈا

کے نعل میں چپکے سے بیج پر بیٹھ گیا۔

”اب کیا حالت ہے؟“

”وہی ہے۔ رات کو بخار کچھ کم ہو جاتا ہے اور وقت ویسا

ہی رہتا ہے۔“

”نہیں، میرا مطلب، دماغی کیفیت کیسی ہے؟ اب بھی

ویسے ہی بکتا جھکتا ہے یا۔“

”بالکل ویسا ہی ہے۔ کل تو گھنٹوں کیرم کیرم لگائے

تھا۔ باہر سے کوئی سنتا تو سمجھتا کہ بیج کونئی کیرم کھیل رہا

ہے۔ میری سمجھ میں تو اس کی حالت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

اب کی کیا دوا بدلی ہے؟“

”دوا تو دوسری بتائی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیسا بخار

ہے مجھے تو ٹائیفائڈ کا شبہ ہوتا ہے۔“

”ٹائیفائڈ اور اس موسم میں؟“

”کیوں اس میں کیا؟ ٹائیفائڈ تو اب ہر موسم میں سننے

میں آنے لگا ہے۔ میرا خیال یہی ہے۔ لیکن وہ کچھ بتاتے

نہیں، چاہے ہزار کوئی اُن سے پوچھے۔“

”ہومیوپیتھی میں ہی تو سب سے بڑی دقت ہے۔ بس

اندھے کے ہاتھ کی خلیل لگ گئی تو واہ واہ۔ نہیں تو چلو۔  
 ”ہاں“

”ان کینختوں کے وہاں تو بس علامت ہی علامت کی  
 رٹ لگی رہتی ہے۔ یہ سیمپٹم اور وہ سیمپٹم، معلوم نہیں الا بلا کیا  
 بکتے ہیں سب“

”ہاں، مگر تم خیال رکھنا کہ آخر کیا کیا بکتا ہے کیونکہ اس  
 پر وہ بہت زور دے رہے ہیں“

”دیتے ہیں۔ اُس میں بھی کوئی فرق ہے۔ بخاریز نہیں  
 ہو اگر کیرم کی گوٹ، کمل اور نہ جانے کیا کیا اناپ سناپ  
 کئے لگتا ہے۔“

”ٹھہر کر، سامنے دیکھتے اور کچھ سوچتے ہوئے۔“ بیچک  
 کو نہ جانے ہو کیا گیا ہے۔ میراجی گھبراتا ہے۔ معلوم نہیں کیا  
 ہو۔ لیکن کون ہے یہ شیل کمل۔“

”کامریڈ تم بھی کمال کرتی ہو۔ کہاں کہاں سے مارا آ رہا ہوں۔  
 تم نے ایک پیالی چاؤ کو بھی نہ پوچھا اور۔۔۔ پہلے پارٹی کی خبریں  
 تو سنو، کیا کمال کر رہے ہیں شہر میں یا لوگ“  
 ”واگڈ اچھٹ اٹھ کر جانے لگی۔“ معاف کرنا کامریڈ۔

باتوں باتوں میں بھول ہی گئی تھی۔ چار گرم ہوگی۔ میں ابھی پی کر آئی ہوں۔ برتن آگ پر رکھا ہے۔ آج دن بھر چار ہی تو پیتی رہی۔ ایسی بدلی اور سردی کہ —

”شہرہ! ہاں، دیکھنا اُسے نہ جگانا اگر سو گیا ہو تو۔ ورنہ پارٹی وغیرہ کی تمام بکواس کرنے لگے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس کے اوپر اس کا بھی بڑا اثر ہے۔ ایسے نازک وقت پر وہ اس طرح بیکار ہو گیا۔ اگر کسی طرح اُس کے دماغ سے پارٹی اور کام کا خیال نکل جاتا“

”یہ ہو جاتا تب کیا تھا۔ چاولے کر آئی“

”سناذرا۔ مستو تو نہیں آیا تھا؟“

”آئی! دور سے چیخ کر واکڈ اسکان کے پیچھے غائب ہو گئی۔“

انور نے اسکان کے سامنے کے دروازہ پر تالے کو بند دیکھا اور سوچنے لگا۔ اپنے جان میں ہم لوگ ہر طرح احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن یہ کیسوت مہتو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ معلوم نہیں اس کے ہر کیا بھوت سوار ہے۔ لالچ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ہر طرح سمجھایا کہ جب ہم لوگ کامیاب ہو جائیں گے تو چھادنی اور یہ ساری زمین تمھاری ہو جائے گی۔ لیکن وہ تو روز ہی

کوئی نیا افسانہ راج کر لاتا ہے۔ اسے کوئی مہکاتا تو نہیں ہے؛  
 یہاں ہم لوگوں کے ہونے کی کسی کو خبر بھی کیا ہوگی۔ لیکن یہ  
 روز کوئی نہ کوئی یہانا گڑھ کر ہم کو ڈراتا ہے۔ سمجھ میں نہیں  
 آتا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ کام ہی  
 توڑ کر رکھ دے گا۔

ہریش کی حالت ایسی ہے ورنہ کوئی اور انتظام کرنے کی سوچتے۔  
 لیکن اب اسے لے کر کہاں جائیں۔ پارٹی کا سارا کام ستیاناس  
 ہو رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بمبئی والے سمجھتے نہیں کہ ہم لوگ  
 کس طرح یہاں کام چلا رہے ہیں۔ جب دیکھے تقاضا لگا رہتا  
 ہے کہ جو ڈھیلا پڑتا ہے اسے کاٹ کر الگ کر دو۔ لیکن اس طرح  
 روز ہم کاٹتے جائیں تو رہی کتنے جائیں گے۔ اور جب ہمارے  
 سامنے مرنے جینے کا سوال ہے ہم کیسے اتنی سختی سے کام لے کر  
 اپنا کام کر سکتے ہیں۔ ہر طرح کے آدمی ہیں ہمارے ساتھ،  
 الگ الگ ان کے کام کر نیکے طریقے ہیں۔ سب کو ایک ہی  
 پیمانے سے تو ہم ناپ نہیں سکتے۔ اور پھر ہم کو کیا مطلب کہ  
 کس کے اندر کیا گزر رہا ہے۔ کسی کے ذاتی مسئلوں سے  
 ہم کب تک الجھتے رہیں۔ اور اس نظریہ سے کام لیں تو گاڑی

کیا آگے چل بھی سکتی ہے۔ کام سے غرض، کسی کے ذاتی مرحلوں سے غرض تو ہے نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ کون کتنا کر سکتا ہے۔ سب ایک ساتھ کر سکتے بھی نہیں۔ ہاں، پوتو کا طریقہ ہرگز صحیح نہیں۔ اس میں شک نہیں۔ یہ وقت نہیں ہے کہ ہم اپنے ذاتی مسئلوں سے اس طرح اُلجھے رہیں۔ دشمن آج اپنی ساری طاقت ہمارے ہی خلاف لگا رہا ہے اس لئے اگر ہم نے حد درجہ احتیاط اور جانبازی سے کام نہ لیا تو ایک ہی چھاپے میں ہم ختم ہو سکتے ہیں۔ پوتو کا وہ حال ہے۔ نیبی کے کام کرنے کا اپنا ڈھنگ ہے۔ ہریش اس طرح پڑا ہوا ہے۔ ہریش کا سوال۔

ہریش کا خیال آتے ہی ہریش کے واسطے انور کے سارے نرم جذبات ابھر آئے اور وہ اُس کے بارے میں اُس وقت سے سوچنے لگا جب وہ ناظر صاحب کا کل سات سال کا ایک لڑکا تھا۔ گھر میں اکیلا ہونے کی وجہ سے اُس کا بچنا پلھ عجیب سنجیدگی کے ماحول میں گذرا۔ ناظر صاحب اس قسم کے والد نہیں تھے جو کئی لڑکے کھو کر آخری لڑکے پر اپنی ساری محبت لاد اور پیار بچھا دے بلکہ دو بڑے لڑکوں کی جوان

موت دیکھ کر وہ اولاد کی طرف سے ایسے مایوس ہو گئے تھے کہ جیسے ہریش کا گھر میں ہونا یا نہ ہونا اُن کے واسطے برابر تھا۔ مطلب اس کا یہ نہیں کہ وہ لڑکے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے تھے یا اُن کی مایوسی نے کسی قسم کی سختی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کے خلاف، ہریش کے ساتھ اُن کا کچھ ایسا سلوک تھا۔ جیسے پہلے لڑکے تھے ویسے ہی ہریش بھی ہے۔ اُس کے

رہنے میں اُن کا اتنا ہی ہاتھ تھا جتنا دوسرے بچوں کے نہ رہنے میں رہا ہوگا۔ اس لئے اگر اُن لڑکوں کے نہ رہنے پر وہ مرنے لگے تو آج ہریش کے رہنے پر جی کیسے اٹھتے۔

ایسے گھر میں ہریش کی زندگی اس طرح شروع ہوئی۔ پچھنا تنہائی میں گذرا۔ کوئی دوسرا بچہ گھر میں تھا نہیں جس سے اُس کے بچپن کو نشوونما ملتی۔ پاس پڑوس میں وہ جا نہیں سکتا تھا اُس لئے کہ ماں باپ کو وہ چیز زیادہ پسند نہ تھی۔ اس لئے اسکول سے اگر بقیہ وقت گھر ہی میں گزارتا۔ اُس کے لئے ماں اور باپ کی زندگی کے درمیان اگر کوئی فرق تھا تو یہ کہ ماں زیادہ وقت پوچھا پاٹ میں گذارتی تھیں۔ اُنھیں بڑے لڑکوں کے نہ ہوتے کا اتنا ہی افسوس تھا جتنا ہریش کے ہونے پر تسکین

تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ بھگوان کی سیوا میں زیادہ رہتی تھیں۔  
 لیکن ناظر صاحب کو نہ افسوس تھا اور نہ تسکین۔ اس لئے اُن  
 کی نظریں شاید بھگوان بھی اب ایک غیر ضروری چیز تھے۔  
 جہاں تک ہریش کا سوال تھا، ماں اور باپ دونوں کا براؤ  
 اُس کے ساتھ یکساں تھا کیوں کہ جہاں ناظر صاحب اپنی  
 طبیعت یا فطرت کی وجہ سے ہریش سے نہ بہت خوش اور نہ  
 مانوس ہو سکتے تھے وہاں اُن کی بیوی اس ڈر سے ہریش کو  
 سوچ کر یاد دیکھ کر زیادہ خوش نہ ہوتی تھیں کہ وہ خوشی شاید  
 بھگوان کو پھر اچھی نہ لگے۔ چنانچہ ہریش اپنے گھر کی ایسی اولاد  
 تھا جس کے والدین اُس سے اس وجہ سے خوش نہیں رہتے  
 کہ اُن کی خوشی شاید بھگوان کو اچھی نہ لگے اور وہ اُسے دنیا سے  
 اٹھالیں۔ ایسے بچوں کو اکثر لا پرواہی سے رکھا جاتا ہے ،  
 انھیں معمولی کپڑے پہنائے جاتے ہیں ، ناک اور کان  
 چھدوا کر انھیں بد شکل بنا دیا جاتا ہے اور اُن کے بے تکے  
 نام رکھے جاتے ہیں۔ اس بے توجہی کے پیچھے توجہ اس بات  
 پر رہتی ہے کہ اُس کی طرف خدا کے فرشتوں کی توجہ نہ ہو۔  
 خوشی کا اظہار اس وجہ سے نہیں کیا جاتا کہ خوشی سے ناراض ہو کر

بھگوان اُس خوشی کو بھین نہ لیں۔

انور، جو ہریش کی ابتدائی زندگی سے بخوبی واقف تھا، ہریش کے بارے میں اس طرح غور کرتے کرتے اُس کو ایک سماجی مسئلہ بنا کر سوچنے لگا، اور پھر اس سوالیہ نتیجہ پر پہنچا کہ جس بچے کے واسطے زمین اور آسمان کے درمیان اُسید و بیم کی ایسی پیش بندی ہوتی ہو اُس وقت اُس بچارے بچہ کے اوپر کیا میتی ہوگی۔ اور اس مسئلہ پر جب اُس نے نفسیاتی نظریہ سے سوچا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہریش بچپن ہی سے بیمار تھا۔ بیماری سے اُس کا مطلب نفسی بیماری تھی۔

کا مرید واگڈ ایک ہاتھ میں چائے کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں تشری جس میں کھانے کی کوئی چیز تھی، لئے آگئی جس وقت وہ ناشتہ کی چیزیں انور کے بغل میں بیچ پر رکھنے لگی تب بھی وہ خیالات کی بھول بھلیاں میں کھویا ہوا تھا اور اُس کے سوچنے کا سلسلہ اُس وقت تک نہیں ٹوٹا جب تک کہ واگڈ نے کہا نہیں ”دو پہرے بکتا بکتا اب جا کے سویا ہے“

”ہریش بہت دنوں سے بیمار ہے۔ حالانکہ اُس نے کبھی ایسے مانا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُس بیماری سے اُسے کبھی نجات نہ ملی

شاید مل بھی نہیں سکتی تھی۔“  
 بے سرسیر کی بات سن کر واگڈا سے جب رہا نہ گیا تو اُس نے  
 کسی قدر تعجب سے کہا۔ ”رہ رہ کر یہ کیا بکنے لگتے ہو تم؟ آخر کون  
 کب سے بیمار ہے؟“

انور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ او۔ گلاس سے چائے پیتے ہوئے اُس  
 نے کہا۔ ”نہیں میں نے یہ کہا کہ بیچارہ ہر شیش ہمیشہ سے بیمار  
 رہا ہے۔ تم نے پوچھا نہ تھا کہ مکمل مکمل وہ کیا بکتا ہے۔“

اتنا کہہ کر انور اپنے خیال کے اشارے سے ایک دم چونکا  
 اور خود کو سنبھالنے کی غرض سے گرد سے بھری ہوئی بیج پر بیٹھنے  
 کے لئے جگہ دیکھنے لگا۔ اُس نے سوچا واگڈا اکامریڈ ہی سہی، لیکن  
 کسی عورت سے اس قسم کی باتیں کرنا کہاں تک مناسب ہو سکتا  
 ہے۔ اگر کسی سے محبت یا کوئی ذہنی لگاؤ کسی کو ہو تو اُسے بیماری  
 کہہ کر تو نہیں پکارا جاسکتا۔ اگر مرد عورت کی یا ہی زندگی محض بیماری  
 ہے، نفسی ہی سہی، تو انسانی صحت کے لئے زمین پر صرف مرد  
 یا عورت ہی کو ہونا چاہئے تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس اُلجھے ہوئے  
 طریقہ سے سوچ کر انور نے چاہا کہ بات بدل دے۔ چنانچہ بیج پر  
 بیٹھ کر اُس نے دو گھونٹ جلتی ہوئی چارپی اور تشری میں سے

ایک اخروٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ہریش کے ماں باپ جب سے مرے تبھی سے اُس کی حالت بگڑنے لگی۔ یعنی ویسے تو وہ یہ معلوم نہیں ہونے دیتا کہ اُس نے اُس واقعہ سے زیادہ اثر بھی لیا۔ لیکن میں اُس سے چونکہ ایک زمانہ سے واقف ہوں اس لئے مجھے معلوم ہے کہ اُس کے اوپر کیا بتی۔ ماں کا انتقال تو جب وہ بنارس میں پڑھتا تھا تب ہی ہوا۔ لیکن جب گھر گیا تو باپ نے کہا کہ پڑھائی چھوڑ کر اب کوئی نوکری کر لو۔ بات اُسے زیادہ پسند نہ آئی۔ لیکن ہریش کی تو پوری زندگی ہی اپنی خواہش اور مرضی کے خلاف کام کرنے کی جیسے ایک زندہ مثال یا مکمل کہانی ہے۔ چنانچہ جب والد کے سامنے سوائے لفظ ہاں، کے کچھ اور کہنا اُس نے سمجھی سیکھا ہی نہ تھا تو اُن کی بات مان لینے کے سوائے کیا کرتا۔ باپ کی پنشن کا وقت آگیا تھا اس لئے اُنھوں نے سوچا اپنے جیتے جی ہریش کو کہیں کا کردوں۔ لیکن زمانہ ایسا نہ تھا کہ آسانی سے کہیں نوکری مل جاتی۔ گھر میں بیچارہ پڑا پڑا اُو ب جاتا۔ باپ کی صحبت کچھ ایسی تھی نہیں کہ اُن کے ساتھ بھی کسی کا جی لگتا۔“

واگد کو اس کا شبہ تو نہ ہوا کہ انور نے بات بدل دی تھی۔

لیکن اُس کی بے ترتیب گفتگو سے اُسے یہ ضرور خیال ہو کہ آج  
 انور کچھ ایسی ذہنی کیفیت کا شکار ہو گیا ہے کہ بس بکتے ہی رہنا  
 چاہتا ہے۔ چنانچہ شاید اُس کی بات ختم کرنے کی غرض سے والد  
 نے پوچھا۔ ”تو کیا تم اُسی زمانہ سے ہرٹس کو جانتے ہو؟“

انور چاہ پی چکا تھا اس لئے اُس نے جیب سے سگریٹ  
 کی ڈبیانکالی اور اب قمیض اور جانگھئے کی ساری جیبوں پر  
 ہاتھ رکھ رکھ کر دیا سلائی ڈھونڈھ رہا تھا۔ کسی طرح دیا سلائی  
 ملی تو وہ ایسی سیل گئی تھی کہ جلانے سے نہ جلے۔ چنانچہ منہ میں سگریٹ  
 دبائے اور ایک ہاتھ میں ڈبیا اور دوسرے ہاتھ میں سلائی کی  
 بتی لئے اُس نے والد کے سوال کا جواب دیا۔

”نہیں، اُس نے بتایا تھا مجھ کو۔ ملاقات تو اُس سے بہار کے  
 زلزلے کے زمانہ میں ہوئی۔“

”لیکن تم نے بتایا کہ پڑھنا تو یہ چھوڑ چکا تھا؟“

”ہاں پڑھنا کچھ ہی دن پہلے چھوڑے تھا۔ میں بتا رہا  
 تھا نا کہ جس زمانہ میں اُسے نوکری کہیں نہیں مل رہی تھی اور  
 گھر پر بیٹھے بیٹھے ادب جاتا تو جی بھلانے کے لئے پڑوس میں کوئی  
 اسٹیشن ماسٹر رہتے تھے، اُن کے وہاں شام سویرے چلا جاتا

تھا۔ ماں جب زندہ تھیں تو وہ اسٹیشن ماسٹر کے وہاں آتی جاتی تھیں۔ اس لئے اُن لوگوں کو ہریش بچپن ہی سے جانتا تھا۔  
 ” تو کل اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی تھی کیا؟“

”ہاں میں بتا تو رہا ہوں۔ اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی کا نام شیل کل تھا۔ ہریش چھوٹ پنے سے اُس کو جانتا تھا۔  
 چونکہ ہریش کے وہاں سے صرف اسٹیشن ماسٹر ہی کے یہاں آنا جانا تھا اس لئے ہریش اگر کبھی کہیں جاتا تو صرف اسٹیشن ماسٹر ہی کے وہاں۔“

” تو یہ کیرم ویرم جو بکتا ہے شاید اُس اسٹیشن ماسٹر ہی کے یہاں کھیلتا رہا ہوگا؟“

اُس وقت شاید یہ بچہ اُس میں پڑھتا تھا۔ لیکن چھٹی میں آتا تو اسٹیشن ماسٹر ہی کے وہاں جا کر جی بھلاتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی چھٹی میں اسی طرح جب آیا ہوا تھا تو صبح شام اسٹیشن ماسٹر کے وہاں چلا جایا کرتا تھا۔ ایک دن دیر کر کے لوٹا تو اُس کی ماں نے اُس سے رات کو کھانا کھاتے وقت کہا۔ ہریش تمہارے بابو جی پوچھ رہے تھے۔ تمہارا کالج کب کھلے گا؟ بس ہریش کے لئے اتنا کافی تھا۔ چنانچہ وہ

دوسرے دن بنارس کے لئے روانہ ہو گیا۔  
والدہ نے ہریش کے بارے میں اپنی تشخیص صحیح ثابت  
ہوتے دیکھ کر بات کاٹ دی۔ یہ تو میں نے بھی غور کیا ہے کہ  
باوجود اتنا پُرانا اور سمجھا ہوا کامریڈ ہونے کے ہریش نہایت  
ہی نازک مزاج انسان ہے۔ چاہے وہ کسے نا لیکن چھوٹی سے  
چھوٹی بات سے بھی اندر ہی اندر بہت اثر لیتا ہے۔  
”ہاں، دیکھو یہ ابک چھوٹا سا واقعہ کتنی روشنی ڈالتا ہے  
اُس کی پوری طبیعت اور سیرت پر۔ اور سنو، دیکھو آگے کیا  
ہوتا ہے اُس کے بعد اُس نے گھر ہی آنا چھوڑ دیا۔ یعنی  
چھٹیوں میں بھی کم ہی آتا تھا۔ اس طرح اسٹیشن ماسٹر کا  
گھر اور شیل کل سب اُس کے لئے ایک ساتھ ختم ہو گئے۔  
اور اگر پھر کبھی اُن کے وہاں گیا تو کئی سال بعد، یعنی جس  
زمانہ میں سیکارہ گھر پر پڑا تھا۔ لیکن وہ بھی سلسلہ زیادہ دن  
نہ چلا۔ ایک دن یوں ہی پنشن یافتہ ناظر صاحب نے کہا۔  
”تم کو زیادہ کسی کے وہاں نہیں آنا جانا چاہئے، یہ اُس کیلئے  
کافی تھا۔ چنانچہ اسی ہفتہ باپ سے بہانہ کر کے بنارس چلا  
گیا۔ اور وہاں سے یونیورسٹی کے لڑکوں کے ساتھ زلزلہ کے

بعد بہا رگیا۔ لیکن اصلی زندگی اُس کی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کئی سال بعد شیل کمل کے گھر والوں سے ملاقات ہونے پر شیل کمل کے والد نے اُسے پہچانا بھی نہیں۔ شیل کمل سے کہاں سے ملتا۔ میری اُس کی ملاقات۔

باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ انور اور واگڈا دونوں خاموش ہو رہے لیکن جہاں زبانیں بند تھیں دماغ نہیں خاموش تھے۔ دونوں سوچتے رہے اور ہو سکتا ہے کہ دونوں ایک ہی بات سوچتے رہے ہوں۔ اگر ایک ہی بات نہیں سوچتے رہے تو کم سے کم دونوں کے خیالوں کی سُرخمی شاید ایک ہی تھی۔ دونوں سوچتے رہے اور خاموش رہے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ واگڈا نے نگاہیں اٹھا کر انور کی طرف دیکھا۔ جنگلی کُرا، جو چھاؤنی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا، اب برآمدہ میں بھی پھیل گیا تھا۔ انور کا چہرہ واگڈا کو دکھائی نہ دیا۔ واگڈا نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے اُس کے دماغ میں بھی کُرا پھیل گیا ہے۔ اُس نے ایک بار پھر کوشش کر کے انور کو دیکھنا چاہا۔ لیکن ایسا محسوس کیا جیسے انور اُس سے کئی میل کی دوری پر بیٹھا ہے۔

ہریش آج چھ سال سے پارٹی کے ساتھ ہے۔ پارٹی کے لوگ جانتے ہیں کہ اُس کے کندھے پر کتنا بڑا بوجھ ہے۔ لیکن اس کے دل پر کتنا بڑا بوجھ ہے وہ شیل کمل بھی شاید نہیں جانتی۔ میں نے ہریش سے بار بار کہا کہ اگر ہو سکے تو اس بوجھ کو دل پر سے اتار دو۔ تمہارے واسطے یہ اچھا نہیں ہے۔ لیکن ہریش نے ہمیشہ ہنس کر ٹال دیا۔ اور ہمیشہ مجھے یہی سمجھایا کہ آج پارٹی کے کسی آدمی کو اس قسم کی باتوں کو سوچنے کا بھی حق نہیں ہے۔ لیکن جہاں وہ مجھ کو اس طرح سمجھا کر بہلا سکتا تھا، اپنے کو دھوکا دے کر بھی شیل کمل کے تصور سے نجات نہ پاسکا۔ ایک سو دو ڈگری بخار کی حالت میں میں نے ہریش کو پارٹی کے واسطے کام کرتے دیکھا ہے۔ آج میں ایسا سوچتا ہوں کہ اُس نے پارٹی ہی کو شیل کمل سمجھ لیا تھا۔ مسر واگڈانے آنکھیں اٹھا کر انور کی طرف پھر دیکھا۔ لیکن اب اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ بتا سکتی کہ انور وہیں یا وہاں سے کئی میل کی دوری پر سے بول رہا تھا۔ واگڈا ایسا محسوس کر رہی تھی کہ جیسے گہرہ دماغ سے اُتر کر آنکھوں کی پتلیوں پر چھایا جا رہا ہے۔



## آئسو اور بسینہ

کچھ دن ہوئے شاید کسی اخبار ہی میں میں نے خبر دیکھی کہ ایک مہاوت ہاتھی پر سوار کہیں چلا جا رہا تھا۔ مٹی جون کا مہینہ تھا، اس لئے دیہات کی گرمی اپنے شباب پر تھی۔ چنانچہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے مہاوت نے سڑک کے کنارے ایک باغ میں ٹھہر کر ایک پانی کی دوکان سے تاڑی خریدی اور پیاس کی شدت کم کرنے کی کوشش میں شاید دو تین لوٹے پی گیا۔ پھر وہ ہاتھی پر سوار ہوا اور چونکہ شام ہوتے ہوتے شادی میں پہنچنا تھا (اپنی نہیں، دُور دیہات میں کسی زمیندار کے لڑکے کی شادی میں) اس لئے ہاتھی کے سر میں ایک آدھربار آنکوسی اور دونوں کانوں کے نیچے اپنے پیروں کے

انگوٹھے چبھا کر ہاتھی کی رفتار بڑھادی۔ اونچے تاڑے سے  
 شام کی اتاری ہوئی تاڑی کو جب اونچے ہاتھی پر بیٹھے  
 نیل بان کے پیٹ میں دوپہر کی دھوپ لگی تو تاڑی میں  
 جیسے نیا ادبال پیدا ہوا جو شاید گھٹ میں کبھی نہیں ہو سکتا  
 تھا۔ چنانچہ آگے جا کر راستہ کے کنارے دو آم کے درختوں  
 کی گھنی چھاؤں میں نیل بان نے ہاتھی کو روک دیا اور اُس نے  
 سوچا کہ زمین پر انگوٹھا بچھا کر کچھ دیر آرام کر لے۔ مٹی جون  
 کی دوپہری کھلے ہوئے میدان میں پتے ہوئے سورج کی  
 گرمی لئے ہوئے سنسنار ہی تھی۔ ہوا کسی طرف سے اپنا  
 آہٹ بھی نہیں دیتی تھی۔ ہاتھی اُس گرمی میں درخت کے نیچے  
 کھڑا رہا اور جھومتا رہا۔ لیکن پیٹھ پر بھاری ہودہ لئے کب  
 تک ایک ہی جگہ کھڑا جھومتا رہتا۔ چنانچہ جب مہاوٹ نشہ  
 کی گہری نیند میں سویا ہوا تھا ہاتھی اُس کے آس پاس  
 گھومنے لگا۔ سونڈ سے اُس نے یہ سونگھا اور وہ سونگھا۔  
 لیکن کچھ کھانے کو تھا نہ پینے کو اور گرمی وہی تھی۔ سونڈ  
 اوپر کی طرف اٹھا کر اُس نے آم کی پتیوں کا بھی اندازہ  
 لگایا۔ لیکن آم کی اونچی پتیاں اُس کے لئے انگوٹہ ہوتے

ہوئے بھی سمجھے رکھتی ہی رہیں۔ اس لئے اب وہ اپنی سونڈ  
 کے نوک سے ہاتھی بان کے سرہانے آہستہ آہستہ  
 ٹٹولنے لگا۔ اکثر مہادت لوگ پوٹلی سر کے نیچے رکھ کر سو  
 جاتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی کیا ملتا۔ اس لئے اب ہاتھی  
 سونڈ سے مہادت کی ناک سونگھ رہا تھا۔ ایک بار  
 سونگھا، دو بار سونگھا۔ کچھ اچھا ہی لگا ہوگا۔ مہادت  
 کی بھینگی بھینگی سانس تاڑی سے شرابور تھی۔ اب جو ہاتھی  
 کو شرارت سوجھی تو اُس نے سونڈ کی باریک نوک،  
 جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہاتھی اُس کی  
 مدد سے زمین پر سے سوئی اٹھا سکتا ہے، سے مہادت  
 کے دانے کان میں ٹٹولا۔ نشہ سے چور مہادت چونک کر  
 اٹھ بیٹھا۔ ہاتھی بالکل سرہانے کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ نہ سکا۔  
 ہاتھی کا بایاں پیر اپنے سر کے پاس دیکھ کر اُسے غصہ کا  
 ایک جھونکا سا آیا۔ اُس کے دُھندھے دماغ سے ایک  
 دُھندلی سی تصویر گزر گئی جس میں مہادت کے سر پر  
 ہاتھی کا پیر تھا۔ کچھ صاف تو وہ سوچ نہ سکتا تھا، تاڑی  
 شاید سوچنے نہیں دیتی تھی۔ پھر جیسے نشہ کا ایک لہرا

آیا اور فیل بان نے ہاتھی کی طرف دیکھ کر جیسے غصہ اور  
 محبت کے ملے جلے بھاؤ سے کہا۔ "کیوں بیٹا، ایسی بات؟"  
 فیل بان نے محسوس کیا کہ جیسے ایک لمحہ کے لئے ہاتھی  
 مسکرایا۔ چنانچہ جب ہاتھی نے اپنا داہنا قدم آگے کی طرف  
 اٹھایا تو ہاتھی بان اٹھ کھڑا ہوا اور اچھل کر وہ دس قدم  
 دور گیا اور پھر اُس نے داہنی جانگھ پر تال ٹھونک کر  
 آگے بڑھتے ہوئے کہا "اچھا تو آ جاؤ جو ان آج، پھر دیکھا  
 جانی" یہ کہہ کر وہ آگے لپکا اور ہاتھی کی سونڈ پکڑ کر اُس  
 سے اپنی پوری طاقت لگا کر لڑنے لگا۔ ہاتھی کی سمجھ میں بھی  
 وہ پہلوانی کا تماشہ کیا ہی آیا ہوگا۔ لیکن جب  
 اُس نے دیکھا کہ تھوڑی دیر زور آ کر اُس کا سوات  
 بار بار پیچھے جاتا ہے اور پھر زور سے تال ٹھونک کر  
 آگے اچھل کر ہاتھی کی سونڈ سے کھبے کی طرح لڑتا اور  
 زور آتا ہے اور ساتھ ساتھ لکار لکار کر آوازیں بھی  
 دیتا ہے تو ہاتھی نے سمجھا کہ فیل بان شاید کھیل کر رہا  
 ہے۔ ہاتھی نے فیل بان کو سونڈ میں پمپٹ کر اُسے  
 ہلکے سے زمین پر دے دیا۔ اور جب اُسی وقت اُس کے

سر میں بھی کھیل کی گرمی پیدا ہوئی تو اس کا داہنا سرفیل بان کے سر پر گیا۔

اس خبر کو اخبار میں پڑھ کر جب مہات کو میں نے تال ٹھونک کر ہاتھی کو چٹوتی دیتے ہوئے سوچا تو جیسے پسینہ آ گیا لیکن جب اس بات پر غور کرتا ہوں کہ نامہ نگار نے یہ خبر اخبار میں دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ مہات نے تقریباً ایک گھنٹہ انارٹی پی لیا تھا اور ہاتھی کو بھی تاڑی پلا دیا تھا تو آدمی کی مورکھتا کو سوچ کر آنکھ میں آنسو آجاتا ہے۔ جس آدمی کو یہ سوچنے کی جیسے عادت پڑ گئی ہے کہ دو اور دو مل کر چار ہوتے ہیں، وہ یہ آسانی سے نہیں سوچ سکتا کہ ہاتھی کو چٹوتی دینے کے لئے آدمی کو ایک گھنٹہ تاڑی پینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور پٹھ پر پانچ من کا ہودہ بندھے ہوئے ہاتھی کو دس میل دھوپ میں چل کر داہنا سرفیل بان کے سر پر رکھنے کے لئے تاڑی کے نشہ کی ضرورت نہیں۔

آدمی اُس زندگی کو کیا کہے جس میں خوشی اور غم ویسے ہی ہوں جیسے شطرنج کی بساط پر سفید اور سیاہ خلعے۔ انسانی حوصلوں کے لئے ہمیشہ تاڑی یا شراب کے نشہ کی شاید

ضرورت نہیں ہوتی۔ بقول شخصے، زندگی میں کسی نشہ کا سہارا لینا خود شکست کا اعلان ہے۔ حوصلوں کے کھنڈروں ہی پر عموماً شراب اور تاڑی کے چراغ جلتے ہیں۔ اقبال کا شعر ہے یہ

وہی دیرینہ بیماری وہی ناختمی دل کی  
علاج اس کا وہی آبِ نشاطِ انجمن ہے ساقی

آدمی کے جب سارے حوصلے ختم ہو جاتے ہیں تب ہی شاید وہ فیل بان ہوتا ہے۔ درتہ زندگی کا میاب بنانے کے لئے ہاتھی رکھنا ہی کیا کم تھا۔ نشہ کی حالت میں جو حوصلہ پیدا ہوا وہ ہاتھی کو شکست دینا کبھی بھی نہ تھا۔ لیکن ہاتھی کجخت اسے کب سمجھتا ہے۔ اس لئے ہاتھی بان مر کے بھی یہی کہتا ہے یہ  
گھر میں کیا تھا کہ تیرا غم جسے غارت کرتا  
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

جب تقدیر بننے کو ہوتی ہے تو جو بھی آتا ہے وہ کچھ نہ کچھ دے کر جاتا ہے اور جب وہ بگڑتی رہتی ہے تو جو آتا ہے وہ کچھ لے کر ہی جاتا ہے۔ آدمی اور دوسرے جانداروں میں ایک ہی فرق مانا گیا ہے  
عقل کا۔ لیکن عقل کو خود ہم حوصلہ کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے آدمی اور دوسرے جانداروں میں اصل فرق حوصلہ ہی کا ہے۔ چنانچہ آدمی

کے حوصلہ نے جو چراغ جلا یا اسی کی روشنی کو انسانی تہذیب کہتے ہیں۔ لیکن روشنی کے حاشیوں پر تاریکی ہے۔ چاہے آدمی اُس روشنی سے خوش ہو اور اس تاریکی سے مایوس ہو، یا پہلے کو تاریکی اور دوسرے کو روشنی سمجھے۔ انسانیت کے لئے نتیجے بد لیتے نہیں۔ مہادت مر گیا، ہاتھی زندہ ہے۔ جب روشنی بجھ جاتی ہے تو تاریکی پھیلتی ہے۔ کسی کو تاریکی سے ڈر لگتا ہے کسی کو بغیر نشہ کے حوصلہ سے نشہ کا حوصلہ تو فیل بان کا تھا۔ اُس سے کون ڈرے گا۔ مہادت آنسو اور پسینہ کا مضمون ہے۔ آنسو غم اور خوشی دونوں کے ہوتے ہیں۔ پسینہ کامیابی کی کوشش کے لمحہ میں آتا ہے۔ لیکن شکست کی شرم کا پسینہ اور ہی ہوتا ہے۔ فیل بان ہمارا آنسو بھی تھا اور پسینہ بھی۔















